تعمیرِ حیات

ہفت روزہ

شعبۂ تعمیر و ترقی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلد نمبر (۱۶) | ۱۰ ستمبر ۱۹۷۹ء | ۱۷ شوال المکرم ۱۳۹۹ھ | شمارہ نمبر ۲۱

زرِ تعاون

اندرون ملک ——— ۱۲ روپے

فی پرچہ ——— ۵۰ پیسے

بیرون ملک۔ بحری ڈاک ۔ جملہ ممالک ۴ پونڈ

ہوائی ڈاک

ایشیائی ممالک ۶ پونڈ

افریقی ممالک ۷ پونڈ

یورپ و امریکہ ۹ پونڈ

اس دائرہ میں اگر سُرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس شمارہ پر آپ کا چندہ ختم ہو چکا ہے لہٰذا اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ دین و ادب کا خادم، ندوۃ العلماء کا ترجمان، آپکی خدمت میں پہنچتا رہے تو اس کا سالانہ چندہ مبلغ سترہ روپے ارسال فرمائیے۔ اگر اگلے شمارہ کی روانگی سے پہلے آپ کا چندہ یا خط موصول نہ ہوا تو یہ سمجھ کر کہ آپ کو وی۔ پی ہی سے چندہ ادا کرنے میں سہولت ہے۔ اگلا پرچہ منجانب وی پی خرچ ۵۰/۱۹ Rs کے مطالبہ میں وی۔ پی سے روانہ ہوگا۔ چندہ یا خط بھیجتے وقت اپنا نمبر خریداری لکھنا نہ بھولیں۔

شمس الحق ندوی

خشک سالی اور خوش حالی

کا

خدائی قانون

اس وقت ملک کا عجیب حال ہے، ایک طرف اس کے بعض علاقوں میں سیلابوں کی طغیانی برپا ہے، دوسری جانب اس کے دس صوبوں پر خشک سالی کے سیاہ بادل منڈلا رہے ہیں، خاص طور سے یوپی اور مدھیہ پردیش سخت خشک سالی کی لپیٹ میں آئے ہوئے ہیں، اگر موسم کی یہی حالت رہی تو ضروری اشیاء کے انتہائی مہنگی ہو جانے اور غلہ کے نہ صرف مہنگا ہو جانے بلکہ مارکیٹ سے اس کے بالکل ہی غائب ہو جانے کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا ہے چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کی بقار کو وسائل معیشت کے ساتھ مربوط کر دیا ہے اس لئے خشک سالی کی اس حالت اور سیلابوں کی اس کیفیت کو دیکھ کر لوگوں پر سخت ہراس اور دہشت کی کیفیت طاری ہو گئی ہے، یہ ہراس اگرچہ فطری ہے تاہم اس پر ممکن حد تک قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے لوگوں کو سوچنا چاہیئے کہ موسم کی یہ تبدیلی اور فضا کی یہ ناسازگاری کیا از خود وجود میں آگئی ہے؟ اور اس میں خدا کے ارادہ اور اس کی مشیت کا کوئی دخل نہیں ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ بات بداہتہً غلط ہے کیونکہ جب یہ دنیا اور ساری کائنات خدا کے پیدا کرنے ہی سے وجود میں آئی ہے تو اس کے موسموں کے تغیرات، اس کی فضا کی تبدیلی اور اس کے اجزاء کا بناؤ بگاڑ از خود کس طرح ممکن ہے؟ پس یہ حالت لازماً خدا ہی کی پیدا کی ہوئی ہے، اس طرح کی حالتیں طاری کرنے میں خدا کی بڑی حکمتیں ہیں، ماضی میں بھی یہ واقعات پیش آچکے ہیں اور ان کے بیان کے ساتھ ان کی بعض حکمتیں بھی بیان کر دی گئی ہیں، ایک عام حکمت تو اس طرح کے واقعات کے رونما ہونے کی یہ بیان کی گئی ہے کہ انسانوں کو ان کی غفلت، بغاوت اور سرکشی سے باز رکھنے کے لیے یہ حالتیں طاری کی جاتی ہیں، چنانچہ ان حالتوں کو طاری کرنے کے بعد قدرت پوچھتی ہے،

أَفَلَا يَتُوبُونَ إِلَى اللَّهِ وَيَسْتَغْفِرُونَهُ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۔

کیا لوگ اللہ کی طرف رجوع نہیں ہوتے اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی نہیں مانگتے حالانکہ اللہ تو بہت معاف کرنے والا اور بہت رحم فرمانے والا ہے۔

کہیں فرمایا گیا ہے:-

وَلَقَدْ أَخَذْنَاهُم بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُونَ ۝

اور ہم نے ان کو عذاب میں بھی مبتلا کیا مگر نہ تو وہ خدا کے آگے پست ہوئے اور نہ اسکے سامنے گڑگڑائے۔

ایسا بھی بہت ہوتا ہے کہ غافل و نافرمان انسان پر جب معیشت کی تنگی اور قحط کی حالت طاری ہوتی ہے تو وہ شکایت اور تعجب کے ملے جلے انداز میں کبھی دل ہی دل میں اور کبھی زبان سے کہتا ہے کہ میرے رب نے یہ حالت طاری کر کے مجھے رسوا کر دیا ہے؟! اس کے جواب میں اس کو بتلایا جاتا ہے،

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا۔

ہرگز ایسا نہیں، بلکہ تم یتیم کا اکرام نہیں کرتے اور محتاج کو کھلانے کی آپس میں تاکید نہیں کرتے اور کھا جاتے ہو وراثت کا مال سمیٹ کر اور پیار کرتے ہو مال کو جی بھر کر۔

اس جگہ رزق روزی کی تنگی کا سبب یہ بتلایا گیا کہ لوگ یتیموں کا اکرام اور ان کی نگہداشت چھوڑ دیتے اور محتاجوں کی خبر گیری پر ایک دوسرے کو ابھارنے کی طرف سے غفلت برتنے لگتے اور وراثت کا مال یتیموں اور اس کے دیگر وارثوں کو دینے کے بجائے خود کھانے لگتے ہیں تو خدا کا غضب قحط، خشک سالی اور رزق کے فقدان کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

سورۂ بقرہ کی آیات میں جان و مال کے نقصان، طرح طرح کے اندیشہ اور خوف کے طاری کرنے کی ایک عمومی حکمت یہ بھی بتلائی گئی ہے کہ اس کے ذریعہ لوگوں کے صبر و ثبات کو آزمایا جائے اور فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ ان مشکلات میں ثابت قدم رہ کر خدا کے حضور عرض کرتے ہیں کہ ہر چیز کی طرح خود ہم بھی اللہ کی ملک اور اسی کے محکوم ہیں اور اُسی کی طرف خود ہم بھی لوٹ کر جانے والے ہیں ان کو خصوصی نوازشوں اور رحمتوں کی بشارت دی گئی ہے اور ان کو کامل ہدایت یافتہ ٹھہرایا گیا ہے۔

کبھی خشک سالی اور قحط کی شدت کسی باصلاحیت انسان کی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے، لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کرنے اور دین حق کا پیغام سُننے کے لیے مخلوق کو اس کے گرد جمع کرنے کی غرض سے بھی طاری کی جاتی ہے، سیدنا یوسف علیہ السلام جیل کی آہنی دیواروں کے اندر محبوس تھے، اس وقت اللہ تعالیٰ مصر کے بادشاہ کو ایک خواب دکھلاتا ہے، اور اُس خواب کو حضرت یوسفؑ کے سامنے جیل میں پیش کراتا ہے، وہ اس کی صحیح تعبیر کے ساتھ بہترین تدبیر بھی بتلا دیتے ہیں، بادشاہ ان سے متاثر اور خوش ہو کر ان کو اپنا اراذ دار اور خاص درباری بنانے کی پیش کش کرتا ہے لیکن وہ اس کو قابل اعتنار بھی نہیں سمجھتے بلکہ صاف الفاظ میں اپنی قابلیت و اہلیت سے اس کو باخبر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مجھ کو مصر کے خزانوں کا مختار کل بنا دو، کیوں کہ میں بہت بڑا امانت دار بھی ہوں اور ساتھ ہی بہت بڑی سوجھ بوجھ اور بہت بڑا علم بھی رکھتا ہوں، ان کا مطالبہ منظور کرتے ہوئے ان کو وزیر غذا بنا دیا جاتا ہے اور وہ نزدیک اور دور سے آنے والوں کو حسب ضرورت پورے انصاف کے ساتھ اللہ کا دیا ہوا رزق تقسیم فرمانے کے ساتھ انکو دین حق

میں نے اسلام کیوں قبول کیا؟

پروفیسر اے۔ ایچ۔ پی لفبسوٹ

برمنگم سے شائع ہونے والے پندرہ روزہ "صراط مستقیم" کے شکریہ کے ساتھ ایک نومسلم امریکی پروفیسر اے ایچ پی ہیوٹ کے تاثرات شائع کیے جا رہے ہیں۔

عیسائیت کو میں نے چھوڑا ہے اور اسلام کو اختیار کیا ہے، مجھے یہ بات تسلیم ہے کہ مسیحیت میں بھی حق و صداقت اور مفید اصول موجود ہیں اور اگر مذہب سے وہ تمام بدعتیں دور کر دی جائیں جو پادریوں نے پیدا کر دی ہیں تو یہ مذہب بھی انسانیت کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے لیکن ان بدعتوں نے اس کی اصل صورت کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے اور اسے بالکل بے جان کر دیا ہے۔ اس کے برعکس اسلام ہی اس شکل میں ہے جس میں وہ جلوہ گر ہوا تھا۔ اور چونکہ میں ایسے مذہب کی متلاشی تھا جو آمیزش سے پاک ہو اس لئے میں نے اسلام قبول کر لیا۔

آپ کسی عیسائی کلیسا میں چلے جائیں وہاں نقش و نگار اور مورتیوں کے سوا آپ کو کچھ نہیں ملے گا، اس کے علاوہ پادریوں کے زرق برق لباس پر نظر دوڑائیے پھر ان کے طرائقوں، راہبوں کے ہجوم کو دیکھئے تو پتہ چلتا ہے کہ روحانیت کا ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں، سالہا سال معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی عبادت گاہ میں نہیں بلکہ ایسے بت خانے میں ہیں جو صرف بتوں کے پوجا کے لئے بنایا گیا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ نماز میں رکوع و سجود کا منظر اثر پر کشش ہوتا ہے کہ کوئی انسان اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مسجد کی پوری فضا اور اس کی تمام چیزیں روحانیت کی جانب انسان کی رہنمائی کرتی ہیں۔ نہ یہاں تصنع ہے نہ بناوٹ کی قسم کی کوئی چیز۔ اس کے برخلاف کلیسا کی تمام چیزوں میں مادی دنیا کا مظاہرہ بہت زیادہ ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ کہیں کہ پروٹسٹنٹ مذہب تو ان عیوب سے پاک ہے۔ اس نے تو ان گرجوں سے بت اور تصویریں نکال پھینکی ہیں۔ تم نے اسلام کی بجائے اسے کیوں قبول نہ کیا؟ بلاشبہ پروٹسٹنٹ مذہب حقیقی مسیحیت سے قریب تر ہے باوجود اس اعتراف کے کہ مسیح علیہ السلام جلیل القدر پیغمبر تھے۔ میں ہرگز ان کی الوہیت کا قائل نہیں۔ میرا یہ کوئی نیا عقیدہ نہیں بلکہ ابتدا ہی سے اس کا اظہار کرتا رہا ہوں۔ اسلام نہ صرف حضرت مسیح علیہ السلام کا پورا احترام سکھاتا ہے بلکہ دنیا کے تمام مذاہب اور بانیان مذاہب کے احترام کی دعوت دیتا ہے میرا عرصہ دراز سے اسلام کی طرف رجوع تھا لیکن میرا ایمان اتنا قوی نہ تھا کہ میں بے دھڑک اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر سکتا۔ یہ تذبذب کسی انسان یا سوسائٹی کے خوف کی بنا پر نہیں تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں پوری طرح اسلام کی خوبیوں اور خصوصیتوں سے واقف نہیں تھا۔ میں اسلام کے بارے میں اسلام کی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا اور میری آنکھیں کھلتی گئیں اور مجھے صاف طور پر اس دین متین کی خوبیاں اور اس کے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بنی نوع انسان پر احسان معلوم ہو گیا اور آخر میں نے اس دین متین کو اپنا مذہب بنا لیا۔

اسلام میں جو توحید پرستی میں نے پائی ہے وہ کسی دوسرے مذہب میں موجود نہیں اور اسلام کی اسی توحید پرستی نے مجھے سب سے پہلے اس مذہب کی طرف مائل کیا۔ اسلام میں جو سب سے بڑی خوبی میں نے پائی وہ یہ ہے کہ اسلام صرف روحانی ترقی کا نہیں بلکہ دنیاوی ترقی میں بھی بہت بڑا محمد و معاون ہے وہ ان کو گوشہ نشینی اور راہبانہ زندگی گذارنے کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ وہ کارزار حیات میں آگے بڑھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ وہ دینی معاملات میں ہی ان کی راہنمائی نہیں کرتا بلکہ دنیا کے ہر معاملہ میں ان کیلئے راستہ بناتا ہے اور قدم قدم پر بنی نوع انسان کو روشنی دکھاتا ہے۔ اسلام نے دنیا کو عاقبت کی کھیتی قرار دیا ہے اور اسے حق قرار دیا ہے کہ وہ دینی فرائض سے بھی غافل نہ ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ موجودہ سائنسی دور میں اسلام ہی ایسا مذہب ہے جو ترقی یافتہ دنیا کا ساتھ دے سکتا ہے۔ اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تنگ نظری اور تعصب کا شدید مخالف ہے وہ صرف اپنے ہم مذہبوں ہی کے ساتھ مروّت یا محبت کی ہدایت نہیں کرتا بلکہ وہ کل بنی نوع انسان کے ساتھ ہم دردی و مساوات کا حکم دیتا ہے وہ تفریق کا نہیں اتحاد انسانی کا قائل ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس مذہب نے پہلی مرتبہ انسان کو انسانیت کا سبق پڑھایا ہے۔

میں گذشتہ ۵ سال سے مذہب اسلام کا پیرو ہوں، جس چیز نے میرے ایمان کو تقویت دی وہ اسلام کے بلند اور پاک اصول ہیں، اس کی عالم گیر اخوت ہے اس کی بے نظیر مساوات اور اس کا علم و عرفان جس نے میرے دل و دماغ میں ایک نئی روشنی پیدا کر دی۔

اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو سرتاپا علم و عمل، بلکہ یوں کہئے ایک ایجابی دین ہے۔ کوئی اگر صحیح معنوں میں عیسائی بننا چاہے تو اسے دنیا سے کنارہ کشی کر کے گوشہ نشینی اختیار کرنا ہوگی، نیز اسلام میں رہ کر دنیا کی تمام نعمتوں اور نعمتوں سے مستفید ہو سکتے ہیں نہ ہمیں عبادت کا گوشہ اختیار کرنا ہوگا اور نہ ہی ویرانوں میں زندگی بسر کرنا ہوگی اگر ان کو اسی لئے دنیا میں بھیجا گیا ہے کہ وہ گوشہ نشینی میں اپنی زندگی برباد کرے تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ انسانی زندگی کا پھر مقصد کیا ہے؟ یہ صرف اسلام نے بتایا ہے کہ انسان کارگاہ حیات میں رہ کر قدرت کی ہر چیز سے فائدہ اٹھائے مگر ساتھ ہی اپنے پروردگار اور مخلوق کو نہ بھولے۔ میں نے جب سے اسلام قبول کیا ہے انتہائی سکون محسوس کرتا ہوں۔ میری دنیا بھی درست ہو گئی اور آخرت بھی۔

(بشکریہ دعوت دہلی)

ریاست میں فسادات کی نئی لہر سے مسلمان خوف زدہ اور فکرمند

جمشید پور میں اقلیتی فرقہ کی اندھا دھند گرفتاری اور خانہ تلاشی بند کیجائے

امارتِ شرعیہ کے ناظم مولانا سید نظام الدین صاحب کا بیان

پٹنہ ۳۰ اگست

امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ کے ناظم مولانا سید نظام الدین صاحب نے ریاست میں فرقہ وارانہ کشیدگی کی تازہ لہر پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے حسب ذیل بیان دیا ہے:-

جمشید پور میں دوبارہ فساد پر اتر آیا گیا، اور بہت سے فرقہ وارانہ جھڑپوں سے پوری ریاست کی مسلم آبادی میں خوف و ہراس اور عدم تحفظ کی لہر دوڑ گئی ہے۔ ملک اس وقت سیاسی عدم استحکام، گرانی اور خشک سالی جیسے سنگین مسئلوں سے دوچار ہے۔ ان مسئلوں کو حل کرنے کے لئے ہمیں سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ فرقہ وارانہ امن و یک جہتی ہے۔ میں ہر مذہب و ملت کے لوگوں سے اپیل کرنا چاہتا ہوں کہ سماج دشمن عناصر کے ذریعہ جذبات کو مشتعل کرنے کی کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دیں۔ فساد ہو جانے پر فسادی بچ نکلتے ہیں اور غریب بے گناہ لوگ مارے جاتے ہیں۔

جناب ناظم صاحب نے مزید کہا ہے کہ ملک میں انتخابی سرگرمیاں شروع ہو گئی ہیں اس لئے اندیشہ ہے کہ دو فرقوں کے فرقہ وارانہ جذبات کو برانگیختہ کر کے سیاسی پارٹیاں اس کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گی۔ اس لئے انتظامیہ کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے اس سے ہر لمحہ چوکنا اور مستعد رہنا ہوگا۔ وزیر اعلیٰ بہار نے حالیہ واقعات کے پیچھے سیاسی عناصر کا ہاتھ ہونے کا شبہ ظاہر کیا ہے۔ انہیں چاہیئے کہ ایسے عناصر کو بے نقاب کریں۔ ناظم صاحب نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ دونوں فساد میں متاثر ہونے والوں کی موثر امداد کی ذمہ داری قبول کرے۔

ناظم صاحب نے جمشید پور میں اقلیتی فرقہ کے لوگوں کی اندھا دھند گرفتاری اور خانہ تلاشی کی مذمت کرتے ہوئے کہا ہے کہ انتظامیہ کی جانبدارانہ کارروائی سے اقلیتی فرقہ کے لوگوں میں خوف اور سراسیمگی کی لہر دوڑ گئی ہے اور وہ اپنے گھروں میں خود کو غیر محفوظ محسوس کر رہے ہیں۔

اور توحید الٰہی کا پیغام بھی دیتے ہیں۔

حضرت یوسفؑ کے اس واقعہ میں دنیاوی حکمرانوں کے لئے بہت بڑی عبرت اور رہنمائی ہے، اگر ان کو ایمان نصیب ہو اور خدا کا خوف ان کے دل میں جاگزیں ہو تو آج کی بدحال دنیا ان کے حسن تدبیر اور ان کی بے غرض خدمت خلق سے خوش حال بن سکتی ہے۔ ایسے حکمرانوں کی داد و دہش ان مصیبت کے ماروں تک محدود نہیں رہتی جو مجبور ہو کر ان کے دروازوں پر دستک دیتے اور ان کے آگے دستِ سوال دراز کرتے ہیں بلکہ خدا کا خوف ان کی نیند کو اڑا دیتا اور ان کو رات کی اندھیری میں گلی گلی پھراتا ہے وہ ایک ایک دروازہ پر کان لگا کر بیکسوں اور مصیبت کے ماروں کا حال معلوم کر کے ان کی حاجتوں کو پورا کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور جب کوئی بڑھیا بھوک سے روتے اور بلکتے ہوئے اپنے بچوں کے ساتھ ان کو نہیں نظر آجاتی ہے تو رات کی تاریکی میں یہ اپنی پیٹھ پر آٹے اور کھجوروں سے بھری بوری لاد کر ایک ادنیٰ مزدور یا غلام کی طرح دوڑتے ہیں اپنے ہاتھ سے حلوا تیار کرتے ہیں اور جب روتے اور بلکتے بچے پیٹ بھرنے کے بعد کھیلنے اور ہنسنے لگتے ہیں — تب ان کو اپنی مغفرت اور اُخروی نجات کا اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ فاروق اعظمؓ اور دیگر خلفائے راشدین کے متعلق اسی طرح کے واقعات سے تاریخ و سیرت کی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے آپ کے صحابہ کے اندر دوسروں پر نہ صرف اپنا فاضل مال خرچ کرنے کا مثالی جذبہ پیدا ہوا تھا بلکہ ان کے اندر ایثار یعنی اپنی شدید ضرورت کے مقابلہ میں دوسرے بھائی کی ضرورت کو اہمیت اور ترجیح دینے کی ایسی نادر الوجود صفات پیدا ہو گئی تھیں جو انبیاء علیہم السلام کے سچے پیروؤں کی سیرتوں کے علاوہ دنیا کی تاریخ میں کہیں دیکھنے کو نہیں مل سکتیں۔

جنگ کے میدان میں جھلستی ہوئی ریت پر تین صحابی زخموں سے نڈھال پڑے تھے، موت ان کے بہت قریب تھی پیاس کی شدت انتہا کو پہنچی ہوئی تھی، ایک کی آواز سنی گئی، پانی — پانی پلانے والا ان کے قریب آیا، پیالا ان کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ ابھی پانی کا گھونٹ لینے نہیں پائے تھے کہ قریب سے آواز آئی۔ پانی — اس آواز کا پہلے ساتھی کے کان میں آنا تھا کہ ان کا جذبۂ ایثار بیدار ہو گیا، انہوں نے پانی پینے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ پہلے میرے بھائی کو پلاؤ، ان صاحب کے پاس پانی لے جایا گیا اور ان کے ہونٹوں سے قریب بھی کر دیا گیا، عین اسی وقت تیسرے ساتھی کی آواز ان کے کان میں آئی — پانی۔ انہوں نے بھی یہی فرمایا کہ پہلے میرے بھائی کو پلاؤ لیکن جب پانی پلانے والے صحابی ان کے قریب پہنچے تو ان کی روح جسم سے جدا ہو چکی تھی۔ پلٹ کر دوسرے ساتھی کے پاس آئے تو وہ بھی اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، پہلے ساتھی کے پاس گئے تو وہ بھی سفر آخرت اختیار فرما چکے تھے۔ رضی اللہ عنہم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روزے سے تھیں، افطار کا کوئی انتظام گھر میں نہ تھا، خدا کی شان کہ اُس دن ان کے پاس کسی نے ہدیہ کے طور پر ایک لاکھ درہم بھیجے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اتنے دن ہی دن میں تمام روپیہ حاجت مندوں کو ان کے گھر پر بھجوا دیے، اب افطار کا وقت آیا تو پانی کے سوا کوئی چیز نہیں تھی، خادمہ نے کہا کہ اگر آپ ایک درہم بچا لیتیں تو کھانے کا کوئی انتظام کر لیا جاتا۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ اب کہنے سے کیا فائدہ جب روپیہ تقسیم ہو رہے تھے اُسی وقت یاد دلایا ہوتا جن کے ایثار کے صدقہ میں نہ جانے کتنے چولہے گرم ہوئے ہوں گے وہ پھر رات کو فاقہ کے لیے تیار تھیں،

اگر مسلمان قرآن کی تعلیم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور صحابۂ کرام کی سیرت کی پیروی اختیار کرتے ہوئے ایثار و قربانی اور انفاق فی سبیل اللہ کا یہ پاکیزہ جذبہ اپنے اندر پیدا کر لیں تو نہ صرف یہ کہ مصیبت کے مارے اور بے کس و بے سہارا انسان مصیبتوں سے نجات پا جائیں گے بلکہ باہمی محبت و اخوت کی مثالی فضا بنے گی اور وہ اقتصادی مسائل جو بڑی بڑی حکومتوں سے آج حل نہیں ہو پا رہے ہیں، دیکھتے ہی دیکھتے حل ہو جائیں گے اور یہی چیز اسلام کو نہ جاننے والے لوگوں کے لئے اسلام سے ان کے تعارف کا ذریعہ بھی بن جائے گی۔

قرآن مجید میں انسانی دنیا کے آغاز کا یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ اس وقت کے رسول حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر اس کی سرکشی اور نافرمانی کی پاداش میں قحط اور سخت خشکسالی کا عذاب مسلط ہوا جب اُن کے قرار ہوئے تو اللہ کے رسولؑ نے فرمایا،

استغفروا ربکم انہ کان غفارا یرسل السماء علیکم مدرارا و یمددکم باموال و بنین و یجعل لکم جنت و یجعل لکم انہارا ۔ مالکم لا ترجون للہ وقارا ۔

اپنے پروردگار سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو بلاشبہ وہ بہت بخشنے والا ہے، برسائے گا تم پر آسمان کو موسلا دھار، اور بڑھائے گا تم کو مالوں اور بیٹوں کے ذریعہ، اور کر دے گا تمہارے لئے باغات اور کر دے گا تمہارے لئے نہریں، تم کو کیا ہوا تم اللہ کی بڑائی اور عظمت کا یقین کیوں نہیں کرتے۔

اللہ کے رسول نے صاف الفاظ میں اپنی قوم کو خوشحالی کا یقین دلایا مگر شرط یہ رکھی کہ تم اللہ کے فرماں بردار بندے بن جاؤ۔ آج بھی خدا کو راضی کرنے کی یہی شرط ہے کہ اس کی بندگی اختیار کی جائے اور اپنے تمام گناہوں سے توبہ کر کے کامل ایمانی زندگی کو اپنا شعار بنایا جائے۔

مورخہ ۲۷ اگست ۷۹ء کو

شبلی کالج میں منعقدہ

تعزیتی جلسہ کی قرارداد

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی ناظم دارالمصنفین و معتمد تعلیمات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے اچانک انتقال کی روح فرسا خبر سے شبلی کالج کے تدریسی و غیر تدریسی عملہ کے لوگ و ممبرانِ مجلس انتظامیہ رنج و غم میں ڈوب گئے مولانا شاہ معین الدین صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد مولانا قدوائی مرحوم ان کے جانشین کی حیثیت سے شبلی منزل میں تشریف لائے تھے۔ چند ہی دنوں میں مولانا نے اپنی مذہبی و روحانی اور علمی و ادبی شخصیت و ذات کے اثر سے اعظم گڈھ کے علمی و ادبی و مذہبی حلقہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ مولانا شرافت، انسانیت اور اخلاص کا ایک ایسا پیکر تھے جس کی مثال اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ شبلی کالج کے متعلقین سے مولانا قدوائی مرحوم کا خصوصی تعلق تھا۔ مولانا کی شیرینیٔ گفتار، ان کا نرم انداز تکلم اور دلنشیں انداز بیان اور نماز جمعہ سے قبل ان کا مختصر مگر جامع خطبہ یاد رہے گا۔

ہم لوگ پروردگار عالم سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے مرحوم کے پس ماندگان، اعزہ اور جملہ متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ان کے انتقال سے روحانی و علمی دنیا اور بالخصوص دارالمصنفین اور ندوۃ العلماء لکھنؤ میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کی تلافی کا اپنے فضل سے انتظام فرمائے۔ آمین

محمد محسن عثمانی

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم

چند حسرتیں، چند آنسو

از: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

قلب و قلم کو دنیا میں کیسے کیسے مشکل کام کرنے پڑتے ہیں کہ اگر اللہ ہی ہمت و قوت نہ دے اور ایمان اور رضا بالقضا کا سہارا نہ ہو تو دونوں جواب دے جائیں اور کسی کام کے نہ رہیں۔ ع

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں

انہی تین مہینوں میں دو ایسے عزیز جدا ہوئے جن میں سے ایک لخت جگر تھا، دوسرا قوت بازو، اب یہ تیسرا حادثہ ایک ایسے ہمدم دیرینہ، ایک ایسے دوست و رفیق کی جدائی کا پیش آیا جس کا تقریباً نصف صدی کا ساتھ رہا ساتھ پڑھا، ساتھ پڑھایا۔ دارالعلوم کی تعلیم و تدریس اور ندوۃ العلماء کی تعمیر و ترقی میں چولی دامن کا ساتھ رہا، "الندوہ" (دورسوم) کی ادارت و ذمہ داری، پھر ادارۂ تعلیمات اسلام کے قیام و استحکام، اور اس کے ذریعہ قرآن مجید کی خدمت اور عربی زبان کی تعلیم و اشاعت اور اس کے ترجمان اخبار "تعمیر" کی ادارت و ترتیب میں ہم دونوں ایک دوسرے کے رفیق کار و شریک حال رہے، پھر ندوۃ العلماء کے کاموں میں (بحیثیت معتمد تعلیمات) ان کے گراں قدر مشورے، دارالمصنفین میں بحیثیت شریک ناظم ان کی قیمتی رہنمائی و اعانت اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی پوری پوری نیابت کس کس چیز کو یاد کیا جائے اور کیا کیا وقت یہ سب مسندیں خالی اور محفلیں سونی ہو جائیں، تو کس طرح دل کو تسلی دی جائے اور آنکھوں کے سیل رواں کو تھاما جائے۔ ع

یوں زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

عقیدہ و مسلک سے لے کر تاریخ اسلام کے نظریات، قدیم نظام تعلیم و تربیت کے بارے میں خیالات، ندوہ کے مقاصد اور اس کی صداقت اور اس عہد میں ان کی ضرورت پر غیر متزلزل یقین، اسلام کی دین و دنیا کی جامعیت پر کامل شرح صدر، قدیم و جدید کے صالح و نافع اجزاء کے خوشگوار امتزاج کی ضرورت پر مستحکم عقیدہ، علماء کے منصب قیادت سے دست کش یا معزول ہو جانے اور دین و سیاست کی تفریق کو زوال امت کا اصل سبب قرار دینے پر پورا وثوق اور اس صورت حال کو تبدیل کرنے کی شدید خواہش، اصلاح نصاب، علوم اسلامیہ اور علوم عصریہ کے عمیق و تحقیقی مطالعہ کے ذریعہ علماء کو ان کا کھویا ہوا مقام دلانے کی کوشش یہ سب وہ افکار و خیالات ہیں جن سے مولانا عبدالسلام صاحب عمر بھر وابستہ اور ان کے پرجوش داعی رہے اور جو ان کے عقیدہ کا جزو بن گئے تھے اور جس نے کسی دور میں بھی ان کو ندوۃ العلماء کی تحریک اور اس کی دعوت سے بے تعلق نہیں ہونے دیا، ان مقاصد کے حصول کا سب سے موثر ذریعہ اور ان کے لئے کوشش کرنے کا سب سے مناسب میدان وہ ندوۃ العلماء اور اس کے دارالعلوم کو سمجھتے رہے، آج جب وہ دنیا میں نہیں ہیں تو ان سطور کے لکھنے والے کو اس کے اعلان و اعتراف میں ذرا تامل نہیں بلکہ خوشی محسوس ہوتی ہے کہ اس نے ان خیالات و نظریات میں مولانا سے بہت کچھ سیکھا اور ان پر اس کے یقین کے مستحکم ہونے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔

راقم السطور کہنے کو تعلیم کے آخر سرے میں ان کا رفیق درس رہا لیکن دونوں کی عمروں میں کئی سال کا تفاوت تھا، میں جب دارالعلوم آیا تو اگرچہ عربی زبان و ادب کا (عربی اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے) مجھے خصوصی ذوق پیدا ہو گیا تھا، لیکن عام معلومات اور مطالعہ کے وسعت و تنوع میں مولانا مجھ سے بہت فائق تھے وہ نابغۂ جواں سال و جواں مرگ مولانا عبدالرحمٰن صاحب ندوی نگرامی استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فیض صحبت و تربیت سے جن سے وہ سب سے زیادہ متاثر تھے، اردو کے ایک اچھے مقرر اور مضمون نگار بن چکے تھے اور ان کا فکر و شعور بیدار ہو چکا تھا، ۱۹۲۷ء کے ندوۃ العلماء کے اجلاس کانپور میں جہاں میں ایک کمسن تماشائی کی حیثیت سے گیا تھا، مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی صدارت اور رئیس الاحرار مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خاں اور بہت سے مشاہیر ہند اور زعمائے ملت کی موجودگی میں مولانا کی اردو میں تقریر ہوئی تھی، وہ مولانا شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی اور ندوۃ العلماء اور دارالمصنفین کے پیدا کئے ہوئے لٹریچر پر پورے طور پر حاوی تھے، ندوۃ العلماء کی تحریک کی پوری تاریخ ان کے دماغ میں محفوظ تھی، ندوۃ العلماء کے بانیوں اور کارکنوں اور ان کے مراتب و درجات سے بھی وہ خوب واقف تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو سلامت طبع، ذہنی اعتدال —، تواضع اور شرافت نفس کی دولت سے بھی بہرۂ وافر عطا فرمایا تھا، اس لئے وہ سب کے مرتبہ شناس اور قدردان تھے، غلو، مبالغہ اور عصبیت سے ان کو فطری طور پر مناسبت نہ تھی، اور دلی آزاری اور کسی کی توہین و تحقیر (خواہ وہ ادارہ ہو یا فرد) ان کے مسلک میں کبیرہ گناہ تھا، نصاب تعلیم کے تغیر پذیر اور علوم اسلامیہ کے ترقی پذیر ہونے پر ان کا پختہ عقیدہ تھا، ان کے نزدیک ان میں زمانہ کا ساتھ دینے بلکہ اس کی قیادت کرنے اور اس کے جائز تقاضوں کے پورا کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے، سیاسی خیالات میں وہ ہندوستان کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنے والوں کے ساتھ تھے، ان کا ذہنی نشو و نما "اہلال" و "سمرد" کے مقالین، مولانا محمد علی اور مولانا آزاد کی تقریروں اور تحریک خلافت کے دور میں ہوا تھا، اور ان کے اثرات سے وہ آخر عمر تک آزاد نہیں ہوئے

۱۹۳۶ء سے ہم دونوں دارالعلوم کے حلقۂ تدریس سے وابستہ ہو گئے، ابتداء میں ان کا تقرر تاریخ و اقتصادیات کے استاذ کی حیثیت سے ہوا لیکن جلد ان کو عربی اور دینیات کے اساتذہ میں شامل کر لیا گیا، مولانا کی طبیعت چونکہ بڑی ہمہ جہت واقع ہوئی تھی، ان میں بڑی بے تکلفی و سادگی تھی، طلبہ پر شفقت ان کے ذاتی معاملات سے بھی دلچسپی و ہمدردی اور ان کے ساتھ مساوات کا معاملہ ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی وہ ضوابط و احکام اور سرزنش و تعزیر سے زیادہ افہام و تفہیم اور نصیحت و تلقین کی افادیت پر یقین رکھتے تھے اور پیچیدہ سے پیچیدہ معاملہ میں محبت و ہمدردی اور اخلاق کے اثر کے قائل تھے، اس لئے طلبہ ان سے سب سے زیادہ مانوس اور ان سے قریب ہو گئے تھے، طلبہ کے ساتھ ان کا یہ طرز عمل بعض اوقات منتظمین کے لئے اشکالات کا باعث بن جاتا، اور ان کی حد سے بڑھی ہوئی سادگی، صاف گوئی اور بے تکلفی بعض مرتبہ طلبہ کے لیے وجہ آزمائش بن جاتی، اس سلسلہ میں یہ لطیفہ قابل ذکر ہے کہ چونکہ ان کے سامنے ندوۃ العلماء کے اعلیٰ مقاصد اور اس کے دارالعلوم کا وہ اونچا تخیل تھا جو اس کے بانیوں نے پیش کیا تھا، اس لئے وہ اکثر طلبہ سے بے تکلف کہہ دیا کرتے تھے کہ "بھئی کم لوگ اس دارالعلوم میں تعلیم و رہنمائی کے منصب پر فائز ہونے کے لائق ہیں، علمی اور ذہنی حیثیت سے ہم سے کہیں بلند پایہ استاذ دارالعلوم کے شایان شان تھے مگر کیا کیا جائے کہ قحط الرجال کی وجہ سے یہ خدمت ہم جیسوں کو انجام دینی پڑ رہی ہے" یہ بات انہوں نے بارہا کہی ہیں نے ایک مرتبہ ان سے کہا کہ "مولانا اب زمانہ اس قدر وضع و کسر نفسی کا قدرداں نہیں آپ تو یہ بات تواضعاً کہتے ہیں لیکن طلبہ اس کو نہ صرف حقیقت سمجھ لیں گے بلکہ وہ اساتذہ کو اسی نظر سے دیکھنے لگیں گے، اور اپنے کو مظلوم سمجھیں گے کہ ایسے کم پایہ اساتذہ ان کو پڑھانے پر مامور ہیں، اس سے بجائے فائدہ پہونچنے کے نقصان پہونچے گا، اور اساتذہ کی وقعت ان کی نگاہ میں اور کم ہو جائے گی، جس کی وجہ سے وہ استفادہ سے محروم رہیں گے، لیکن یہ مولانا کا مزاج تھا اور وہ اس عادت کو چھوڑ نہیں سکتے تھے،

وہ نہ صرف درجہ کے استاذ تھے بلکہ طلبہ

ے اتالیق و نگراں اور ان کے مطالعہ اور علمی
ق کے مشورہ رہتا بھی تھے، طلبہ کی انجمن "الاصلاح"
، وہ ناظم بھی رہ چکے تھے اور اس کی افادیت
بڑے قائل تھے، وہ اس کے اردو کے ذخیرۂ
ب اور رسائل سے فائدہ اٹھانے کا برابر
شورہ اور ترغیب دیتے رہتے تھے، اور ان کی
ں ہدایت و ترغیب سے بہت سے ذہین طلبہ
نے فائدہ اٹھایا اور وہ اردو کے اچھے مضمون نگار
ور صحافی اور مصنف بن گئے۔

یہ وہ زمانہ ہے جب ندوۃ العلماء کے ناظم
ولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب، معتمد تعلیمات
ولانا سید سلیمان ندوی اور مہتمم الٰہ کے استاذ اور
یخ مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ تھے، تینوں ان
ی اصلاحیتوں کے قائل اور ان پر اعتماد رکھتے
تھے، جہاں تک مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ کا
خلق ہے ان کے تلامذہ میں مولانا عبدالسلام
صاحب اور مولوی رئیس احمد جعفری الٰہ کے محبوب
زین و مقرب ترین شاگرد تھے، مولانا سے
(جن کو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے خلافت
حاصل تھی) انہوں نے بیعت وارادت کا تعلق
بھی قائم کر لیا تھا، طلبہ کے ساتھ اس خصوصی
تعلق کی بنا پر طلبہ کے معلوماتی دوروں اور
ہندوستان کے تاریخی شہروں اور علمی مرکزوں
میں جانے کے لئے طلبہ کے ساتھ بحیثیت نگراں
اور سرپرست کے انہی کا انتخاب ہوتا، اس
سلسلہ میں وہ طلبہ کو دیوبند، سہارنپور اور
لاہور تک لے گئے، ان سب مرکزوں میں طلبہ
دارالعلوم کی بڑی پذیرائی ہوئی، استقبالیہ
جلسے ہوئے، جن میں وہاں کے بڑے اساتذہ
اور سرپرستوں نے تقریریں کیں، دیوبند میں
مولانا شبیر احمد عثمانی نے، اور مظاہر العلوم میں
مولانا اسعد اللہ صاحب نے تقریر فرمائی اور
مولانا نے اس کا موزوں طریقہ پر جواب دیا۔
لاہور میں حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری
نے شفقت و عنایت کا معاملہ فرمایا ایک مرتبہ
مجھے بھی ان کے اور طلبہ کے ساتھ دہلی اور آگرہ
جانے کا اتفاق ہوا، ہندوستان کی تاریخ ان
کا خاص موضوع تھا، اس لئے ان کی رفاقت
سے طلباء کو گراں قدر علمی فائدے ہوئے۔

جنوری ۱۹۴۰ء (مطابق ذی الحجہ
۱۳۵۸ھ) میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے
حکم سے "الندوہ" کا سہ ماہ اجراء ہوا، اس
کی ادارت کے لئے قرعۂ فال ہم دونوں کے
نام پڑا، اس وقت اس اشتراک عمل کا ایک
دوسرا میدان سامنے آیا، جنوری ۱۹۴۰ء تا
جولائی ۱۹۴۲ء تک جاری رہنے کے بعد
مالی دشواریوں کی بنا پر رسالہ کو بند کرنا
پڑا یہ دور تھا جب ندوۃ العلماء مالی بحران
کے دور سے گذر رہا تھا، تنخواہوں کا بھی
وقت پر تقسیم ہونا مشکل ہو رہا تھا، اس بنا
پر ناظم صاحب ندوۃ العلماء کی ہدایت پر ایک
رند کا جنوبی ہند کا دورہ طے پایا، یکم مئی
۱۹۳۶ء کو یہ وفد روانہ ہوا، اس وفد کے
قائد و سرپرست حضرت مولانا حیدر حسن خاں
صاحبؒ تھے اور رکن ہم تین، مولانا مرحوم،
مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی نائب
مہتمم دارالعلوم اور یہ راقم السطور، اس وفد
نے ناگپور اور مدراس کا دورہ کیا، سفر میں ایک
دوسرے کا ایسا تجربہ ہوتا ہے جو حضر میں سالہا
سال کی یکجائی میں نہیں ہوتا، بہت سی کمزوریاں
جن پر پردہ پڑا رہتا ہے سفر میں بے نقاب سامنے
آجاتی ہیں۔ مولانا کی بے نفسی سادگی اور تواضع
کھل کر سامنے آئی اور ہم میں سے کسی کو اس
طویل سفر میں دوسرے سے کوئی شکایت نہیں
ہوئی۔

پھر ۱۹۴۳ء میں وہ وقت آیا کہ بعض
خاص حالات کی بنا پر ان کو دارالعلوم سے
علیحدگی اختیار کرنی پڑی، یہ ان کے لئے زندگی
کا بہت سخت مرحلہ تھا، کہ ندوۃ العلماء کی تحریک
اور اس کا دارالعلوم ان کے دل و دماغ میں
ایسا رچ بس گیا تھا اور ان کی زندگی اس سے
ایسی مربوط ہو گئی تھی کہ اس سے علیحدگی و کنارکشی
ان کے لئے ایک ذہنی صدمہ تھا، اس سے ان
کی زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا ہوتا تھا جس
کا کسی اور چیز سے پُر ہونا مشکل تھا، خدا
جزائے خیر دے لکھنؤ کے ان چند صاحب ذوق،
عالی ہمت عمائد اور حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں
کو جو ان کے درس قرآن میں شرکت کرتے
تھے کہ انہوں نے لکھنؤ میں ایک ادارہ کی بنیاد
ڈال دی جس کا نام "ادارۂ تعلیمات اسلام"
تھا، ان میں پیش پیش سید صغیر حسن صاحب
اسسٹنٹ سکریٹری حکومت یوپی، شیخ ظہور حسن
صاحب ڈپٹی سکریٹری حکومت یوپی (بعد
میں ریونیو سکریٹری اتر پردیش) اور سید اصغر
حسین صاحب گورنمنٹ ایڈوکیٹ یوپی تھے،
اس طرح مولانا کی دارالعلوم سے علیحدگی ایک
بڑے خیر کا ذریعہ بن گئی۔ "ادارۂ تعلیمات اسلام"
میں مولانا نے قرآن مجید کے ذریعہ اور کم سے کم
قواعد کی مدد سے عربی زبان سکھانے اور قرآن
مجید کے فہم و مطالعہ کے لئے تیار کرنے کا بیڑا
اٹھایا۔ انہوں نے اس کے لئے "عربی زبان
کے دستی سبق" کے نام سے ایک رسالہ تیار کیا
جو ہندوستان میں بے حد مقبول ہوا، اور
ہزاروں آدمیوں کے عربی زبان سے واقف
ہونے اور اس کا طالب علم بننے کا سبب
بن گیا، بہت جگہ یہ رسالہ نصاب میں بھی
داخل ہے، اور اس بار بار ایڈیشن نکلے،
اس کے ساتھ انہوں نے تمرین الدروس
(۱-۲-۳) اور قرآن مجید کی پہلی، دوسری
تیسری کتاب کا بھی سلسلہ شروع کیا، لکھنؤ
میں سکریٹریٹ اور دفتروں میں کام کرنے
والوں، کالجوں میں پڑھنے والوں، اور
انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد
یہاں عربی زبان سیکھنے اور قرآن مجید پڑھنے
آنے لگی اور اس میں دینی ذوق اور عربی
کا شوق پیدا ہوا اور بہت سے لوگ اس
قابل ہو گئے کہ وہ قرآن مجید سمجھ کر پڑھنے
لگیں، مولانا کی محبت و اخلاق اور سادگی
و تواضع نے ان کو اور گرویدہ کیا اور یہ
ان کے دین اور علمائے دین سے قریب ہونے
کا ذریعہ بنا۔

ان باقاعدہ اسبا اور جماعتوں
کے علاوہ ادارہ میں دو عمومی درس ہوتے
تھے ایک قرآن شریف کا جس کا ذمہ میں نے
لیا تھا، اور ایک حدیث شریف کا جو اکثر
مولانا دیا کرتے تھے، قرآن شریف کے درس
میں حاضرین کی تعداد سیکڑوں تک پہونچنے
لگی حتیٰ کہ ادارۂ تعلیمات اسلام کا ہال اسکے
لئے ناکافی ثابت ہوا، اور اس کا انتظام
عمارت کی وسیع چھت پر کیا گیا، اس وقت
اس درس اور ادارۂ تعلیمات اسلام کی طرف
ایسا رجوع ہوا کہ اگر لکھنؤ میں جمعہ کون بوجہ کسی
اعلیٰ عہدہ دار مسلمان اور صاحب ذوق آگریؔ
داں کو تلاش کرنا ہو تو اس کے ملنے کی جگہ یہی تھی۔

اسی کے ساتھ مسلمانوں کے شعور کی
تربیت (جس کی ضرورت ۱۹۴۲ء کے بعد
شدت سے محسوس ہونے لگی تھی) اور دینی واقفیت
کے لئے "تعمیر" کے نام سے ستمبر ۱۹۴۶ء سے
ایک دینی رسالہ کا اجراء بھی عمل میں آیا مولانا
اور راقم السطور کا نام بحیثیت مدیر کے درج ہوتا
تھا اس رسالہ میں بڑے فکر انگیز اور ایمان
افروز مضامین شائع ہوئے، اور یہ پرچہ
سنجیدہ حلقوں میں مقبول ہو گیا، واقعہ یہ ہے
کہ ادارہ تعلیمات اسلام" ایک ایسا ثقافتی
اور تربیتی مرکز بن گیا تھا، جس کی دور دور
مثال نہیں تھی، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بعض
ذہین فضلاء جن میں مولانا عبدالغفار ندوی
(حال سکریٹری جماعت اسلامی اتر پردیش) علی احمد
کیانی مرحوم، مشیر الحق صاحب بحر آبادی (حال
ڈاکٹر مشیر الحق صدر شعبۂ اسلامیات و عربی جامعہ
ملیہ اسلامیہ دہلی) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، کچھ دن
فاضل گرامی عم محترم مولانا سید محمد طلحہ صاحب ایم۔ اے نے
بھی وقت دیا اور لوگوں نے ان کے وسیع علم
و تبحر سے فائدہ اٹھایا،

مگر افسوس ہے کہ تقسیم ہند کے بعد جو
باد خزاں چلی اس نے اس پھلنے پھولنے والے
درخت کو بھی خشک کر دیا، اس کی مالی حالت
شروع سے غیر مستحکم تھی، اس کا انحصار صرف اس
کے بانیوں کی اعانت ــــ اور مولانا عبدالسلام
صاحب کے جذبہ ایثار و قربانی اور ان کے
چند رفقاء کے خلوص و تعاون پر تھا، کچھ عرصہ
تک تو مولانا اور ان کے رفقاء نے ان حالات
کا مقابلہ کیا اور اس کو قائم رکھنے کے لیے ہاتھ
پاؤں مارتے رہے لیکن بالآخر حالات کے
سامنے ان کو سپر ڈالنی پڑی، وہ چراغ کو تیل
بتی کے بغیر زیادہ دن جلا نہیں سکتے تھے
یہی زمانہ تھا جب مولانا کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے
شعبۂ دینیات کی نظامت کی پیش کش ہوئی۔
جامعہ سے ان کے گونا گوں تعلقات تھے، وہ
دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بعد وہیں چلے گئے تھے
اور کئی سال رہ کر انہوں نے انگریزی زبان
اور جدید علوم سے واقفیت میں اضافہ کیا تھا،
ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ان کے پرانے استاذ اور
بزرگ تھے ــــ، وہ ان کی علمی و ذہنی
صلاحیتوں اور خوبیوں سے واقف تھے۔ مولانا
نے اس کو لطیفۂ غیبی سمجھا اور رفقاء نے بھی
زیادہ مزاحمت نہ کی کہ وہ خود خدمت کا ایک
بڑا میدان ہے اور مولانا اپنے مذاق و مزاج
اور اپنے ذہن و قلب کی دست کی وجہ سے
وہاں بڑی مفید خدمت انجام دے سکتے ہیں۔
مولانا نے اس پیش کش کو قبول کیا، ۱۹۵۱ء
میں وہ جامعہ منتقل ہو گئے، مولانا نے نہ صرف
یہ کہ اس شعبہ کے معیار و روایات کو (جس پر
کبھی مولانا خواجہ محمد عبدالحی فاروقی اور مولانا
محمد اسلم جیراجپوری فائز رہ چکے تھے) برقرار
رکھا بلکہ اس کے وقار میں اضافہ کیا، وہ بہت

جلد وہاں کی مرکزی دینی شخصیت بن گئے اس
شعبہ کی سربراہی کے فرائض کے علاوہ جمعہ کا
خطبہ دیتے تھے اور گویا جامعہ کے امور مذہبی کے
پورے نگراں و ذمہ دار تھے، وہ اپنی فراخدلی
اور فراخ نظری کی وجہ سے قدیم و جدید دونوں
حلقوں میں مقبول و معتمد بن گئے، ڈاکٹر سید عابد
حسین اور پروفیسر محمد مجیب دونوں ان کے علم،
ان کی شرافت اور ان کے خلوص کے قائل تھے،
عابد صاحب کے رسالہ "اسلام اور عصر جدید"
کے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل ہوئے اور اس
کی کمیٹی کے رکن رکین بن گئے اور آخر وقت تک
رہے۔

بالآخر جامعہ سے بھی سبکدوشی کا
زمانہ آیا اور وہ بہت اعزاز و احترام کے
ساتھ اس سے رخصت ہوئے۔ انہوں نے بقیہ
زندگی علم و دین کی خاموش خدمت لکھنے،
پڑھنے اور اپنے وطن مالوف میں گذارنے کا
ارادہ کر لیا، ندوۃ العلماء کے وہ قدیم زمانہ
سے رکن چلے آرہے تھے، اب اس سے بہتر موقع
نہ تھا کہ ان کے علم و تجربہ اور خلوص و دلسوزی
سے فائدہ اٹھایا جائے۔ چنانچہ مجلس انتظامی نے
(۲۶ شعبان ۱۳۹۲ھ ۵ اکتوبر ۱۹۷۲ء) ان کو
باتفاق آراء دارالعلوم کا معتمد تعلیمات منتخب
کیا اور اسی حیثیت سے انہوں نے ۱۹۷۵ء کے
پچاسی سالہ تاریخی جشن ندوۃ العلماء میں اپنی
فاضلانہ رپورٹ پڑھی، ندوۃ العلماء کے مزاج
اور دارالعلوم کی تعلیمی ضروریات سے ان سے زیادہ
پورے حلقہ میں کوئی واقف نہ تھا، ندوۃ العلماء
کے مقاصد کے بارے میں وہ بڑے ذی حس اور
غیور واقع ہوئے تھے اور دارالعلوم کو اس کی
اصلی حقیقی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے جو بانی ندوۃ العلماء
مولانا سید محمد علی مونگیری اور علامہ شبلی کی تمناؤں،
اعلانوں اور ان کی تحریروں اور خطوط میں پائی
جاتی ہے، ان کو عمر بھر اسی خواب کی تعبیر کے دیکھنے
کی تڑپ رہی جو ان دونوں بزرگوں اور ان کے
باکمال و دوراندیش رفقاء نے گذشتہ صدی عیسوی
کے آخر میں دیکھا تھا، وہ ہمیشہ اسی پیمانہ سے
ندوۃ العلماء کی ترقیات کو جانچتے اور پرکھتے
تھے اور اسی نقطۂ نظر سے خود میرا اور دوسرے
رفیقوں کا محاسبہ کیا کرتے تھے انکے نزدیک
ندوۃ العلماء کی کامیابی کا حقیقی پیمانہ یہ تھا کہ
مختلف علوم اسلامیہ کے ماہرین فن اور صاحب
تحقیق و نظر علماء پیدا ہوں، جو اس عہد انقلاب میں
مسلمانوں کی دینی علمی رہنمائی علیٰ وجہ البصیرۃ
کر سکیں اور علماء کا اعتماد، بحال اور علوم اسلامیہ
کے تفوق کا نقش قائم کر سکیں۔ افسوس ہے
کہ ان کی وفات کے بعد اب ایسا کوئی آدمی نہ
رہا جو خود ذمہ داران و کارکنان ندوۃ العلماء
کا احتساب کر سکے اور ان کی خامیوں اور
غلطیوں پر ان کو متنبہ کرے۔ ع
وہ کوہکن کی بات گئی کوہکن کے ساتھ

مولانا ان سب جشنیوں اور
مختلف ذمہ داریوں کے ساتھ جن کا اپنے اپنے
موقعوں پر ذکر آیا، اردو کے ایک منجھے ہوئے
پختہ کار و کہنہ مشق لکھنے والے تھے، انکی تحریریں
زبان یا محاورے کی غلطی ڈھونڈھے سے
نہیں ملتی تھی، انہوں نے اردو کے عناصر اربعہ
(مولانا حالی، مولانا شبلی، ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی
محمد حسین آزاد) اور اساطین ادب کی تصنیفات
بچپن سے پڑھیں اور ان کے ذہن و ذوق نے
ان کو پورے طور سے اپنا لیا تھا، وہ بعض ہندگیر
شہرت رکھنے والوں کی تحریروں میں زبان
کی غلطی نکالتے تھے وہ اودھ کی تہذیب، معاشرت
اور خاندانوں کے رکھ رکھاؤ سے خوب واقف
تھے، بزرگوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت
اسی انداز سے کرتے تھے جیسا شرفائے اودھ
کا دستور رہا ہے، وہ اپنے چھوٹے عزیزوں
اور رفیقوں کی پوری حوصلہ افزائی اور
قدر دانی کرتے، اور ان کی ترقی و کامیابی سے
خوش ہوتے، ان کو نیک مشورہ دیتے اور چاہتے
تھے کہ وہ زیادہ سے زیادہ علمی کمال و فنی امتیاز
پیدا کریں۔

میں بھی ان کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا
کہ طالب علمی سے فراغت کے بعد ایک زمانہ میں
جب تصوف کی بعض کتابوں کے مطالعہ سے
مجھ پر زبان و ادب کی بے حقیقتی کا غلبہ ہوا۔
اور طبیعت ادب و انشاء سے اچاٹ بلکہ بیزار
ہونے لگی اور میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی ساری
دلچسپیوں اور توجہات کو مقاصد اور دینی علوم
کے دائرہ میں محدود کر دوں گا، اسی زمانہ میں
اپنے وطن رائے بریلی جاتے ہوئے لکھنؤ پھر اور اس
تک (جو مولانا کا وطن ہے) میرا ان کا ساتھ ہو گیا
میرے اس رجحان سے وہ واقف تھے، سارے راستے
وہ مجھے اس سے باز رکھنے اور دینی مقاصد
اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے زبان و ادب
طالب علم سے وضو کرتے ہوئے کہا کہ "جلدی
کرو آج نماز اردو میں ہو رہی ہے"۔ اکثر
مسکراتے ہوئے کہتے تھے میں تو نماز بھی اردو
میں پڑھاتا ہوں لیکن ان کا یہ وصف جو دوسروں
کی نگاہ میں بعض اوقات نقص معلوم ہوتا،
حقیقت پسندوں کی نگاہ میں اس دور تصنع و
تکلف بلکہ دور نفاق و ریا میں بڑا کمال اور
قابل رشک صفت تھی۔

پھر جب مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی
کی وفات سے دارالمصنفین میں مسند سلیمانی
دوبارہ خالی ہوئی تو پھر پورے دبستان شبلی
اور بزم سلیمانی میں نظر انہی پر پڑی اور ان
سے درخواست کی گئی کہ وہ دارالمصنفین میں
قیام اختیار کریں اور "معارف" کی ادارت
اور رفقاء کی رہنمائی و تربیت میں ان دونوں
گرامی مرتبت پیش روؤں کی نیابت کریں اس
درخواست میں میں پیش پیش تھا، آخر میں میرا
اصرار ان کی معذرت پر غالب آیا اور انہوں
نے یہ ذمہ داری قبول کی اور محترمی سید
صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کو اس سے بڑی
تقویت اور مدد ملی، ان کو مولانا کی موجودگی
میں اور زیادہ دلجمعی اور سکون خاطر کے ساتھ
ادارہ کی توسیع و ترقی کا موقع ملا اور اسی
اطمینان کی بنا پر وہ کئی کئی مہینے دارالمصنفین
سے باہر رہ کر اس کے مالی مسائل کی فراہمی میں
ساعی و سرگرم رہے اور وہ خلا نہیں محسوس
ہونے پایا جو ایک صاحب نظر عالم دین کی (جو
اصل دینی و عربی مآخذ پر براہ راست نظر رکھتا
ہے اور علوم اسلامیہ میں اس کی نظر وسیع و گہری
ہے) غیر موجودگی میں ایسے ادارہ میں محسوس ہو سکتا
ہے جس کا مزاج دینی و علمی ہے اور جس کا خمیر سیرت
و تاریخ اسلام سے اٹھا ہے۔

یہ تو ان کی علمی حیثیتوں اور کمالات کی
طرف چند اشارے تھے، ان کی تمام صفتوں پر
جو صفت میرے نزدیک سب پر غالب تھی وہ ان
کی شرافت نفس، انسان دوستی، بے آزاری اور
عام ہمدردی کی صفت تھی، اللہ نے ان کو کیوں
کی سی معصوم فطرت دی تھی، وہی بے ساختگی،
وہی بے تکلفی، کسی کو نقصان پہونچانے، کسی کا دل
دکھانے کی یا تو ان میں صلاحیت نہیں تھی یا تھی تو
وہ بہت محدود جس کو انہوں نے شاید عمر بھر استعمال
نہ کیا ہو، ہر ایک سے محبت و سادگی سے ملتا، اس
کا حال احوال پوچھتا، اس کی ضرورتوں سے واقف
ہونے کی کوشش کرنا، اس کی مدد کرنے کی خواہش
اس چیز نے ان کو اپنے قصبہ میں بھی اور جہاں جہاں
وہ رہے بڑا محبوب اور ہر دل عزیز بنا دیا تھا،
اس کا پورا اندازہ اس وقت ہوا جب انکی وفات

(بقیہ صہ ۱۶)

تقدیرِ الٰہی کے آگے سرِ تسلیم خم

از: مولانا محمد عارف سنبھلی ندوی

تین ماہ کی قلیل و مختصر مدت میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تین نہایت ممتاز اور مایۂ ناز شخصیتیں اس دنیا سے رخصت ہوگئیں، فرزندانِ ندوہ بالخصوص محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، پر تین بار کوہ غم ٹوٹا، سب سے پہلے خانوادۂ حسنی کے نادر المثال اور یگانۂ روزگار نوجوان فاضل مولانا سید محمد الحسنی علیہ الرحمۃ کی وفات کا حادثہ، جانکاہ بالکل اچانک پیش آیا جو بجلی بن کر گرا اور ہوش و حواس اور شعور و وجدان کو مختل و مبہوت بنا کر چھوڑ گیا پھر اس حادثہ کے ٹھیک پچیس دن بعد مولانا استحق جلیس ندوی سخت بیمار ہوئے اور محض پانچ روز کی مختصر مگر شدید علالت کے بعد عقبیٰ آخرت پر روانہ ہوگئے، ان کی خدمات خاص طور پر تعمیرِ حیات اور پیامِ انسانیت کے لیے دن رات ایک کرنے اور تن من دھن کی بازی لگانے کو مدتوں تک بھلایا نہیں جاسکتا۔ اور ابھی اس حادثہ پر چند ہفتے بھی گذرنے نہیں پائے تھے کہ ندوہ کے مایۂ ناز فرزند، شرافتِ نفس، تہذیب و ثقافت اور متانت و سنجیدگی جیسے اعلیٰ اوصاف میں خاص امتیاز رکھنے والی ہستی بالکل اچانک اس دارِ فانی کو خیرباد کہہ کر اپنے غفور و رحیم رب کے حضور حاضر ہوگئی، ہماری مراد جناب مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم سے ہے، مولانا کی عظیم شخصیت، ملک گیر شہرت کی مالک تھی، آپ اسی شمارہ میں ان کی شخصیت کے بارے میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مختصر ملفوظ پڑھ گے، یہ حوادث یقیناً اپنی خاص نوعیت، اور جانے والوں کی ناقابلِ فراموش افادیت کے لحاظ سے حد درجہ الم ناک اور انتہائی روح فرسا ہیں، جن کے باعث ہمارے دل ٹکڑے، جگر شق اور آنکھیں اشکبار ہیں اور یہ حالت انسانی فطرت کے عین مطابق اور تقاضۂ بشریت کے لحاظ سے بالکل ناگزیر ہے، لیکن ہم خدا کی حکمتوں پر یقین رکھتے اور اس کے فیصلہ پر راضی ہیں، اس لیے ہماری زبان پر انا للہ ..... اور حسبنا اللہ ونعم الوکیل جیسے ایمان پرور کلمات ہی جاری ہو سکتے ہیں، ہم خدا کو اپنا رب بنا کر اور خود کو اس کا محکوم مان کر اس کے بندے بن چکے ہیں اور بحیثیت صاحبِ ایمان اللہ تعالیٰ سے ہمارا جو معاملہ طے ہو چکا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے دستاویز اور اعلان کے طور پر اپنی آخری کتاب قرآن مجید میں قیامت تک کے لیے ان الفاظ میں لکھ دیا ہے،

ان اللہ اشتریٰ من المومنین اموالھم وانفسھم بان لھم الجنۃ۔ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کے مالوں اور جانوں کو جنت کے بدلے میں خرید لیا ہے)۔

ہم اس کو بہت سستا سودا، بڑی نفع بخش تجارت اور سب سے بڑی کامیابی سمجھ کر مطمئن اور راضی ہیں۔

ہم اللہ تعالیٰ کو اپنا رب بنا کر اور خود کو اس کا محکوم و مملوک مان کر اس کے بندے بن چکے ہیں، اور ان المناک حوادث میں بھی ناشکری کا کوئی کلمہ ہماری زبان پر جاری نہیں ہو سکتا، بلکہ محض خدا کی دی ہوئی توفیق سے اس حالت میں بھی ہم خدا کے فیصلہ کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ ہے

ہم کو تقدیرِ الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ
اہلِ تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں

ابھی لکھا جا چکا ہے کہ موجودہ صورتِ حال اپنی خاص نوعیت کے لحاظ سے بہت ہی المناک اور جاں گداز ہے، لیکن ہمارا ایمان ہے کہ یہ حوادث از خود کہیں سے نازل نہیں ہو گئے ہیں بلکہ وہ ہستی جو ساری کائنات کی خالق اور اس کے ذرہ ذرہ کی تنہا مالک بھی ہے، اُسی کی حکمت اور قدرت کے فیصلہ کے تحت ہی ان کا ظہور ہوا ہے، اور یہ حوادث ہمارے لیے کتنے تکلیف دہ و متوقع اور اچانک کیوں نہ ہوں، لیکن مالک ارض و سما کی نسبت سے ہرگز اچانک نہیں بلکہ اُس کے یہاں مدتوں پہلے دفترِ تقدیر میں یہ سب بالکل اسی طرح لکھے ہوئے موجود تھے،

انسان کی زندگی سراپا امتحان اور آزمائش ہے، اُس کی پیدائش اور اس دنیا میں اس کے آنے کی غرض اسی کے بھیجنے والے نے حسب ذیل الفاظ میں ظاہر فرمائی ہے،

خلق الموت والحیاۃ لیبلوکم ایکم احسن عملاً ۝

(موت اور زندگی کو وجود بخشا ہے تاکہ آزمائیں کہ تم میں عمل کے اعتبار سے کون بہتر ہے)

جب ہمارے وجود کی غرض و غایت ہی امتحان و ابتلا ٹھہر چکے ہیں تو ہم کو اس سے فرار کی راہ ڈھونڈنے کے بجائے اس میں کامیاب ہو جانے اور پورے اترنے کے لئے خدا ہی سے توفیق مانگنی چاہیئے۔

امتحان کی ہزاروں صورتیں ہیں، غربت بیماری، دنیوی مقاصد میں ناکامی یہاں تک کہ اپنے عزیزوں، محبوبوں اور خود اپنی جان کے خطرہ میں پڑ جانے کا خوف قرآن مجید نے اصولی طور پر آزمائش و امتحان کی تمام شکلوں کی طرف اجمالی اشارے کر دیے ہیں۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے،

ولنبلونکم بشیئ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات۔

(اور ہم ضرور آزمائیں گے تم کو تھوڑے سے ڈر سے اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور میووں (غلہ وغیرہ) کے نقصان کے ذریعہ)

اور ہر ہر موقع پر ان آزمائشوں میں پورے اترنے اور ثابت قدم رہنے والوں کو بشارت دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے،

وبشر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون اولئک علیھم صلوات من ربھم ورحمۃ واولئک ھم المھتدون ۝

(اور اے نبیؐ) تم خوشخبری دیدو صبر کرنے والوں کو جو کسی بھی مصیبت کے پہنچنے کے وقت کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ تم کی ملکیت ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، ایسے لوگوں پر نوازشیں ہیں ان کے رب کی طرف سے اور رحمتیں، اور وہی ہیں حقیقی ہدایت یافتہ۔

جب انسان کے وجود کا موضوع و مقصد ہی آزمائش و امتحان ٹھہرا تو اُس پر حوادث کا وارد ہونا بھی ناگزیر ہو گیا، اُس حالت میں بھی جب وہ خدا کا ناشکرا، نافرمان، اور اس کے فیصلوں پر ناخوش و ناراض ہونے کا اظہار اپنی زبان و عمل سے کر رہا ہو، اس کے اس طرزِ عمل کی وجہ سے خدا کا یہ فیصلہ ہرگز بدل نہیں سکتا۔ اس حال میں اُس پر حوادث بھی آئیں گے اور اپنی بے صبری کے باعث دنیا اور آخرت کا خسران و ہلاکت بھی اس کے نصیب میں لکھا جائے گا کیونکہ وہ زندگی کے امتحان میں فیل ہو چکا ہے، لیکن اگر انسان کو ایمان کی دولت نصیب ہو، وہ خدا کو اپنا مالک و آقا اور مہربان رب سمجھتا ہو تو امتحان و آزمائش اس کو خدا سے ناراض اور بدظن کرنے اور اُس کا باغی بنانے کی بجائے اور زیادہ خدا کے آگے اس کے جھکاؤ کا سبب بنیں گے، اور ہر چھوٹی بڑی مصیبت پر یہی ایک کلمہ اس کی زبان پر جاری ہوگا کہ میں خدا کا مملوک و محکوم ہوں اور اُسی کی طرف مجھے لوٹ کر جانا ہے، صاحبِ ایمان انسان کی یہ ایمانی کیفیت اس کی آزمائشوں کے بوجھ کو ہلکا کر دیتی ہے، وہ خدا کے نہایت قریب ہو جاتا ہے اور اس کے بدلے میں اس کے حقیقی مالک کی طرف سے جس انعام کی بشارت اس کو دی گئی ہے اس سے بڑھکر کسی انعام کا تصور بھی انسانی طاقت سے باہر ہے۔ انعام یہ بتایا گیا ہے کہ اُس پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی نوازشیں، انعامات اور عنایات ہوتی ہیں اور وہی خدا کے نزدیک صحیح اور کامل ہدایت کا پانے والا بھی ٹھہرتا ہے۔ آزمائشوں پر صبر کے بجائے انعامات کی بارشوں کا یہ وعدہ اور ہدایت یافتہ ہونے کا یہ قطعی سرٹیفکیٹ کوئی معمولی چیز نہیں، یہ تو ہماری زندگی کی اصل غایت اور ہمارے وجود کی اصل غرض ہے، اگر ہم کو سب کچھ کھو کر بھی یہ نعمت نصیب ہو جائے تو سودا برا نہیں کہا جا سکتا۔

پس آج ہم جس آزمائش سے دوچار ہیں وہ بہت سخت ہے اور اس موقع پر ہم جیسے کمزوروں کے بے صبر ہو جانے اور ہمت ہار دینے کا بہت خطرہ ہے لیکن جس نے آزمائش کا فیصلہ فرمایا ہے اُسی سے ہم صبر کی توفیق بھی مانگتے ہیں اور اُسی سے اجر و ثواب کے بھی امیدوار ہیں۔

اُستاذِ گرامی مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ

(مولانا عبدالسمیع صاحب ندوی)

طالب علمی کا زمانہ اکثر و بیشتر فکری ہنگامے اور غیر ذمہ داریوں کا زمانہ ہوتا ہے وہ طلبہ خوش نصیب ہوتے ہیں جو ان خرافات سے دور رہ کر صرف علمی اور تعلیمی مشاغل میں ہمیشہ مصروف رہے، ان کی جوانی، اپنے بچپن ان کے بڑھاپے اپنی جوانی دونوں ہی میں انکی شیرینیٔ گفتار، ان سے بات کرنے اور گفتگو میں مجھنے کی ہمت دلاتی رہی، استاذ تھے، استاذ کی حیثیت سے دل میں اکرام و احترام تھا دارالاقامہ کے نگراں اور مربی تھے اس حیثیت سے ڈر اور خوف بھی تھا، طلبہ ان کی انہام و تفہیم پر بڑے سے بڑے کام کرنے پر آمادہ ہو جاتے ان کی ناخوشی اور ناگواری گراں گذرتی تھی، جب وہ معذرت قبول کر لیتے تھے تو قلب بڑا اطمینان اور سکون محسوس کرتا تھا، درجہ کے اور کسی سبق پر محنت ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو لیکن مولانا کا دیا ہوا سبق خارج وقت میں ضرور پڑھا جاتا اور بار بار پڑھا جاتا تھا۔ اتفاقات اور اسلامی تاریخ کے استاذ تھے "ہماری بادشاہی" نامی کتاب اسی عہد کی یادگار ہے جس کو دارالمصنفین نے بڑے اہتمام سے چھاپا اور بعض تعلیم گاہوں میں داخلِ نصاب رہی۔

مولانا کی تربیت کا انداز بھی جداگانہ تھا غصہ اور گرمی کا تجربہ تو شاید ہی ایک دو بار ہوا ہو، نرمی ہی کے ساتھ وہ بڑی سی بڑی بات کہہ جاتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ نہیں کہا، طالب علم کے معذرت آمیز الفاظ جیسے جیسے ان کے گوش گذار ہوتے جاتے تھے محسوس ہوتا تھا کہ مولانا بھی پگھلتے جا رہے ہیں، پوری بات سن لینے کے بعد ان کے لبوں پر مسکراہٹ آجاتی تھی نرمی سے فہمائش کر کے رخصت کر دیتے تھے، سنگین سے سنگین واقعات پیش آئے لیکن مولانا کے اس طرزِ عمل میں کوئی فرق نہیں آیا کبھی کوئی سخت لفظ یا بُرا بول ان کی زبان سے نہیں سنا گیا۔

طلبہ کی صلاحیتوں کو خوب پرکھتے تھے، شخصیت سازی کا بھی مزاج تھا، طلبہ کی انجمن "الاصلاح" کے مربی تھے، ان کی دینی، ثقافتی رہنمائی بھی کرتے تھے، مولانا کی اس خصوصیت سے بہتر استفادہ بالعموم موسم گرما کی تعطیلات میں ہوتا تھا، "الاصلاح" بند ہو جاتی تھی، اخبارات و رسائل مولانا ہی کے پاس آتے تھے صبح کے ناشتہ کے بعد مولانا کا کمرہ دارالمطالعہ بن جاتا تھا، جس کا سلسلہ دس گیارہ بجے دن تک جاری رہتا تھا تبادلۂ خیال کے ساتھ ساتھ مولانا کی ہدایات بھی کانوں میں پڑتی رہتی تھیں۔ طلبہ تعطیلات میں بزم خطابت بھی آراستہ کرتے تھے، رہنمائی اور تربیت کے نقطۂ نظر سے مولانا کبھی کبھی ان جلسوں کی صدارت بھی کرتے تھے، ان ایام میں طلبہ کی ہمت افزائی بھی کرتے تھے کہ اگر کہیں سے عید میلاد النبیؐ کے جلسہ کی اطلاع آجاتی تو مولانا ان مقیم طلبہ میں سے کسی کا انتخاب کرتے اس کو موضوع بتاتے تیاری کے لئے کتاب کی نشان دہی کرتے، پھر اس جلسہ میں تقریر کے لئے بھیج دیتے۔ اس سلسلہ میں یہ اہتمام بھی تھا کہ تیاری کرنے والے طلبہ کے گروہوں میں خود تشریف لے جا کر ان کی تقریر سنتے، لب و لہجہ کا جائزہ لیتے، مواد کی ترتیب قائم کرتے، طالب علم جب جلسے سے واپس آتا تو مولانا پوری روداد سنتے، غرض تعطیلات کا یہ زمانہ مولانا کی نگرانی میں ہم طلبہ کے لئے سنہرا زمانہ ہوتا تھا، اپنی غفلت اور حماقت کے ساتھ ساتھ مولانا کی توجہ اور کرم فرمائی سے جس قدر اور جو کچھ بھی حاصل ہو جاتا تھا وہ بہرحال کام آتا تھا، اور آج بھی کام آرہا ہے۔

تحریر و صحافت کی بھی یہی سورت تھی، طلبہ کے اندر صحافت کا ذوق پیدا کرنا غائبوں کا انتخاب کرنا، کچھ اشارے دینا، کتابوں کی رہنمائی کرنا، پھر لکھے ہوئے مضامین کی اصلاح کرنا یہ سارے کام مولانا خوشدلی اور اہتمام کے ساتھ انجام دیتے تھے، قلمی رسالہ یا اخبار کی شکل میں کوئی رسالہ یا اخبار الاصلاح میں جاتا تو مولانا سب سے پہلے اسی کو اٹھاتے تھے کوئی کوتاہی یا کمی رہ جاتی تو کس مناسب وقت اس کی نشاندہی کرتے اور مناسب ہدایات دیتے تھے۔

ہم نے دارالعلوم کے حدود میں مولانا کی تقریریں بارہا سنی ہیں، لیکن کبھی یہ نہ محسوس ہوا کہ کوئی مقرر یا خطیب تقریر کر رہا ہے بلکہ ہمیشہ یہی تاثر قائم ہوا کہ مولانا بے تکلف لوگوں میں گفتگو فرما رہے ہیں، اور نہ یہ اندازہ لگایا جا سکا کہ آیا مولانا کو خود بھی یہ احساس ہے یا نہیں کہ ہم کسی مجمع کو خطاب کر رہے ہیں ہمیشہ یہی سمجھ میں آیا کہ مولانا خود بھی یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم اپنے بچوں میں بیٹھے ہوئے ان کے مصالح سے متعلق باتیں چیت کر رہے ہیں تاہم بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مولانا ایک اچھے خطیب بھی تھے، لکھنؤ میں عید میلاد النبی کے جلسے کسی زمانہ میں امیر الدولہ پارک میں ہوتے تھے جن میں ندوہ کے طلبہ بھی جوق در جوق شریک ہوتے تھے غالباً ۳۶ء کی بات ہے، ڈاکٹر سید عبدالعلی رحمۃ اللہ علیہ (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کی صدارت میں ایک جلسہ عید میلاد النبیؐ کا امیر الدولہ پارک میں ہوا، کن کن مقرر نے کتنی تقریریں ہوئیں وہ تو اب یاد نہیں لیکن یہ یاد ہے کہ مولانا صبغۃ اللہ شہید انصاری فرنگی محلی مرحوم نے زبان و بیان کے موتی خوب خوب بکھیرے تقریر ختم ہوئی تو ہم لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہی حاصلِ محفل ہے اور اب اختتام کا اعلان ہوگا، لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی ڈائس پر تشریف لا رہے ہیں، پھر مولانا نے خطابت کے جوہر دکھائے ہر اگلے ہی تو آپ یقین کریں کہ پہلے کی سنی ہوئی اچھی اچھی تقریریں ذہن سے ہوا ہو گئیں اور مولانا صبغۃ اللہ شہید مرحوم جیسے جادو بیان کی تقریر بھی ہمارے ذہنوں میں ٹھہر نہ سکی مولانا ہی کی تقریر حاصلِ محفل رہی، جس پر تبصرہ کرتے ہوئے طلبہ کے گروہ ندوہ واپس ہوئے اور مجھے تو مولانا کی زندگی میں یہ حسرت ہی رہی کہ پھر کسی ایسے عوامی جلسہ میں مولانا مدعو کئے جائیں اور ان کی زبان سے ایک بار پھر اسی انداز کی تقریر سن لوں۔ اس کے بعد دارالعلوم کے جس جلسہ میں بھی مولانا تقریر کے لئے کھڑے ہوئے سر کار بار بار میرا

زبان پر آتے آتے رہ گئی، ممکن ہے دوسروں نے اس انداز کی تقریر مولانا کی سنی ہو لیکن میں تو اس کے بعد پھر محروم ہی رہا۔

اس میں شبہ نہیں کہ ندوی علماء نے اسلامیات پر بڑا وقیع لٹریچر فراہم کر دیا ہے، سیرۃ النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے بارہ میں تو کچھ کہنا نہیں اس کو تو "اسلام" کی انسائیکلو پیڈیا کہتے ہیں، دوسرے مصنفین کی دوسری کتابوں کا بھی اگر آپ مطالعہ کریں تو آپ کو یہ محسوس ہوگا کہ ندوی علماء محدثین کرام کے طبقۂ اولیٰ کی روایات پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں، سیر و سوانح کے سلسلہ میں بھی تاریخ سے زیادہ رجال پر بھروسہ کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابیں ضعیف روایات سے پاک و صاف ہیں۔

مولانا عبد السلام قدوائی رحمۃ اللہ علیہ حدیث میں حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ سابق شیخ الحدیث دار العلوم ندوۃ العلماء کے شاگرد تھے، حضرت مولانا حیدر حسن خاںؒ کو ندوہ کے حدود میں بالعموم "شیخ صاحب" کہا جاتا تھا، ممتاز محدث ہونے کے ساتھ ساتھ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت اور ان ہی کے خلیفہ مجاز بھی تھے۔ مولانا عبد السلام قدوائی "شیخ صاحبؒ" ہی سے بیعت ہوئے، اپنے شیخ کے حالات میں انہوں نے ایک کتاب "مولانا حیدر حسن خاںؒ" چند سال ہوئے لکھی تھی جس کو دار المصنفین نے شائع کیا، روایات کے سلسلہ میں مولانا کا ذوق اسی لئے بہت پاکیزہ اور ستھرا تھا، دوران گفتگو ایک موقعہ پر میں نے ایک حدیث پڑھی تو مولانا نے مجھے ٹوک دیا کئی روایتوں کا حوالہ دیتے ہوئے مجھ سے فرمانے لگے کہ "صحاح میں جب اس باب کی روایات موجود ہیں تو بعد کے محدثین کی روایات کیوں بیان کرتے ہو"، اندازہ ہوا کہ مولانا اس مسئلہ میں اپنے پیشرو ندوی علماء کے ہم مذاق تھے۔

مولانا بذات خود ایک انجمن تھے اور انجمن ساز بھی، شخصیت سازی اور کردار سازی کا اہم رول بھی ادا کرتے تھے، نہ جانے کتنوں کو انہوں نے بنایا، سنوارا، پھر آگے بڑھایا، طلبہ کے ساتھ ان کی شفقت ان کا کرم بے پایاں تھا، ہر وقت اس فکر میں رہتے تھے کہ طالب علم کچھ بن جائے۔

مولانا کا یہ وصف ادارۂ "تعلیمات اسلام" کی شکل میں زیادہ واضح ہو کر سامنے آیا، مولانا نے اپنے چند تربیت یافتہ تلامیذ و رفقاء کی معیت میں قرآنی تعلیمات کو سہل و عام کرنے کے لئے اس ادارہ کی بنیاد ڈالی ان کی فکر یہ تھی کہ اسلامی علوم اور قرآنی تعلیمات صرف علوم عربیہ سے اشتغال رکھنے والوں ہی میں محدود نہ رہیں بلکہ عصری تعلیم سے آراستہ گریجویٹ بھی قرآنی تعلیمات سے اپنے ذہن و فکر کو منور کریں۔ "قرآن مجید کی پہلی دوسری تیسری کتابیں" اسی عہد کی یادگار ہیں۔

اسکول اور کالجوں کے طلبہ کے لئے ابتدائی طور پر ایک کتاب "عربی زبان کے دس سبق" کے نام سے بھی شائع کی جو آج بھی کیرالا وغیرہ کے اسکولوں اور کالجوں میں داخل نصاب ہے،

مولانا اور ان کے تلامیذ رفقاء نے قلیل مدت میں "ادارۂ تعلیمات اسلام" کی جانب سے علمی، دینی، تاریخی لٹریچر فراہم کر دیا جو اگرچہ چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی شکل میں تھا لیکن سادہ اور سہل زبان میں خاصا مفید، موثر اور معلومات افزا تھا۔

مولانا نے "ادارۂ تعلیمات اسلام" درس قرآنی کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا، استاذ گرامی حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی حال ناظم ندوۃ العلماء بھی اس ادارہ سے دلچسپی لے رہے تھے، درس قرآن کی ذمہ داری انہی کے سپرد تھی، حضرت مولانا زید مجدہ کی ہی فکر اور سعی و کوشش سے ادارہ کی جانب سے "تعمیر" کے نام سے ایک پرچہ بھی کچھ عرصہ تک شائع ہوتا رہا،

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شعبہ دینیات کی صدارت قبول کر لینے کے بعد مولانا جیسی کوئی "شخصیت" "ادارہ تعلیمات اسلام" کو پھر فراہم نہ ہو سکی جو مولانا ہی کی طرح اس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناتی تاہم اعلیٰ تعلیمیافتہ طبقہ میں مولانا کے اس کار خیر کی اہمیت پورے طور محسوس کی گئی حکومت کے بعض ذمہ دار مسلمان عہدیداروں نے اپنے طور پر "ترجمہ و تفسیر قرآن" کا سلسلہ عرصہ دراز تک قائم رکھا۔

مولانا بے تکلفی، بے ساختگی کے ساتھ ساتھ دوسروں کی رائے کے احترام کے وصف سے بھی متصف تھے، پوری بے تکلفی اور صفائی کے ساتھ دوسروں کی بات سنتے تھے کسی کی رائے پر کبھی دباؤ نہیں ڈالتے تھے، میں نے دیکھا کہ مولانا نے اپنی کوئی رائے ظاہر کی اس پر ہمارے کسی ساتھی نے جواب کا ایسا پہلو اختیار کیا جو ہم لوگوں کو گراں گذرا لیکن مولانا نے بڑے تحمل و برداشت کے ساتھ اس کی بات سنی، موقعہ ہوا تو افہام و تفہیم کی، مولانا کا یہ وصف ایک اجتماعی معاشرہ اور انفرادی اصلاح کے لئے اہم رول ادا کرتا تھا ان کے چھوٹوں ہی کو معذرت کے ساتھ اپنی رائے واپس لینا پڑتی تھی۔

شخصیت سازی کا مزاج رکھنے والوں کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے منتخب افراد کی رہبری و رہنمائی کے علاوہ دلجوئی کے ساتھ ان کو مجتمع رکھنے کی بھی صلاحیت رکھتے ہوں اس وصف سے اگر وہ محروم ہیں تو شیرازہ بہت جلد منتشر ہو جاتا ہے، اور ایک شخصیت ساز خود کو یکہ و تنہا محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ دل شکستہ بھی ہو جاتا ہے۔

مولانا کا ایک کمال یہ بھی تھا کہ وہ اپنے منتخب افراد کی رہبری و رہنمائی آگے بڑھنے کی ترغیب و تشویق کے ساتھ ان کی دل جوئی کر کے ان کو مجتمع رکھنے کی بھی کوشش کرتے تھے، ندوہ میں تعلیمی و تدریسی وابستگی کے دور میں جن طلبہ کا انہوں نے انتخاب کیا تھا انہی کو لے کر وہ "ادارہ تعلیمات اسلام" میں پہونچے اور جب جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شعبہ دینیات کی صدارت قبول کی تو ان میں سے بیشتر افراد کو لے کر جامعہ چلے گئے، بنایا، سنوارا اور کہیں سے کہیں پہونچایا۔

مولانا ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے اہم رکن تھے جلسہ انتظامیہ کی تاریخیں جب قریب ہوتی تھیں تو مولانا دو تین یوم پیشتر تشریف لے آتے تھے، جلسہ میں پیش ہونے والے مسائل اور تجاویز پر غور و فکر، رائے مشورہ کے بعد فیصلہ میں شریک ہوتے تھے، کئی سال پہلے ان کا بحیثیت "معتمد تعلیمات" انتخاب ہوا تھا، جس کی وجہ سے مولانا کی مصروفیت بڑھ گئی تھی، اسی دوران میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ناظم دار المصنفین اعظم گڈھ کا انتقال ہوا تو ان کی جگہ پر مولانا کا بحیثیت ناظم انتخاب ہوا جس نے مولانا کو اور مصروف کر دیا اپنی علالت کے باوجود دونوں ذمہ داریوں کو پورا کرتے تھے، اوقات مقررہ پر سفر کی صعوبات برداشت کرتے تھے، ان کا ذہن دونوں اداروں کی ترقی اور ان کی بہتری کے لئے فکر و تدبیر میں مشغول رہتا تھا، سوچ بچار، چھان پھٹک کے بعد اپنی تجاویز پر مشورہ کرتے تھے، قلب کے مریض تھے، علاج و پرہیز کا سلسلہ جاری رہتا تھا، بالعموم ہومیوپیتھک دوائیں استعمال میں رہتی تھیں۔ ۲۷ رمضان المبارک کو اپنے وطن قصبہ بھونڈی ضلع رائے بریلی عید کرنے کے لئے تشریف لائے، ۳۰ رمضان المبارک کی شب میں نوافل کے لئے اٹھے، گھر والوں کو سحری کے لئے جگایا، وضو سے فارغ ہوئے تو ضعف محسوس کیا، ڈاکٹر نے آکر دوا دی، صبح ہوتے ہوتے ہیمرج ہوا، ۱۲ بجے دن میں اس طویل بے قراری کو قرار آگیا — انتقال کی خبر درد اور دکھ کے ساتھ سنی گئی۔

پرنٹر، پبلشر، ناظر شعبۂ تعمیر و ترقی ندوۃ العلماء نے جے۔ کے آفسیٹ پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر تعمیر حیات ندوہ لکھنؤ سے شائع کیا۔

مرتبین:
شمس الحق ندوی
(معاون اڈیٹر)
محمود الازہر ندوی

مولانا عبد السلام قدوائی ندوی مرحوم

کی یاد میں ایک تاثر

محترمی! السلام علیکم

مولانا عبد السلام قدوائی ندوی کے اچانک انتقال کر جانے کی خبر ہم پر بجلی بن کر گری یقیناً ان کی رحلت سے قوم و ملت کو جو عظیم نقصان ہوا ہے اس کی تلافی بہت مشکل ہے خصوصاً یہاں اعظم گڈھ کی دینی و علمی دنیا بالکل ویران ہو کے رہ گئی ہے، "دار المصنفین" ایک بار پھر سے اجڑ گیا۔

قرب کے باعث ہم شبلی کالج کے تمام اساتذہ اور دیگر لوگوں کو مرحوم سے ایک خاص تعلق پیدا ہو گیا تھا، جمعہ کے خطبے نے تو انہیں اور بھی ہر دل عزیز اور محبوب بنا دیا تھا، لوگ ان کا خطبہ سننے "دار المصنفین" کشاں کشاں آتے۔ یہاں تک کہ مسجد تنگ ہوتی اور صحن میں شامیانہ لگتا ان کی رحلت سے سبھی غم زدہ ہیں، اور یہ بدنصیب اپنے غم کا حال کیونکر لکھے کہ اسے تو مرحوم سے ایک اور ربط خاص تھا۔ مرحوم پچھلے چند کئی ماہ سے مجھے عربی زبان اور قرآن کریم پڑھاتے تھے۔ آہ! یہ خوش گوار سلسلہ یکلخت ٹوٹ گیا، سرچشمۂ فیض تھم گیا۔

پر اس دوران مرحوم نے اپنی شرافت نفس، کشادہ دلی، بلند نگاہی اور عظیم انسانیت کے جو روشن نقوش چھوڑے ہیں وہ ہماری زندگی میں ہمیشہ ہمیشہ درخشانی کرتے رہیں گے۔

میں نے مولانا مرحوم کی شخصیت سے متاثر ہو کر ایک نظم خراج عقیدت کے طور پر لکھی ہے اس میں زبان و بیان کی غلطیاں ممکن ہیں لیکن میرا خلوص اور میری عقیدت مسلم ہے۔ مجھے امید ہے اس نظم کو آپ "تعمیر حیات" کے اوراق میں ضرور جگہ دیں گے اس کی اشاعت سے مجھے دلی سکون ہوگا۔

خلوص آگیں
ضیاء الرحمٰن الاعظمی
لکچرر شبلی نیشنل کالج۔ اعظم گڈھ
۵ ستمبر ۱۹۷۹ء

وہ عبد السلام، آہ وہ مرد کامل
وہ اک عالم دیں، چراغ ہدایت
خدا مست تھا وہ، خود آگاہ تھا وہ
شرافت کا ماہ مبیں تھا وہ گویا
اسے لالہ و یاسمن کیوں نہ کہئے
نگاہوں میں اک دلنوازی بھری تھی
تھی سیرت بڑی باصفا اللہ اللہ
ہمیں شانِ مومن بتانے کی خاطر
روایات ناقص مٹاتا رہا وہ
ہمیں عشق کا پھر وہی راز بخشا
جگر میں وہی تیر پھر سے چبھویا
زباں کی روانی نہ دیکھی تھی پہلے
بڑا پر کشش اس کا طرز سخن تھا!
گھڑی، پُر وقار، اور بلند اسکی باتیں
نہ بھولے گی وہ مہرباں ہم کو برسوں
وہ روشن ستارہ چمکتا رہے گا
نگاہوں میں ہر دم دمکتا رہے گا

وہ بالغ نظر، سالک راہ منزل
وہ پروانۂ شمع رشد رسالت
حقیقت میں دل کا شہنشاہ تھا وہ
محبت کا چرخ بریں تھا وہ گویا
بہاروں کا رنگیں چمن کیوں نہ کہئے
حرم کی طرح پاک بازی بھری تھی
تھا وہ کس قدر بے ریا اللہ اللہ
حقیقت سے پردہ اٹھانے کی خاطر
ستاروں کی محفل سجاتا رہا وہ
وہی سوز بخشا، وہی ساز بخشا
دلوں میں تمنا کے پھر بیج بویا
وہ جادو بیانی نہ دیکھی تھی پہلے
نہاں سادگی میں بھی اک بانکپن تھا
تھیں سارے جہاں کو پسند اس کی باتیں
نہ بھولے گا وہ مہرباں ہم کو برسوں

قطعہ تاریخ وفات حسرت آیات برادر محترم مولانا حاجی عبد السلام صاحب قدوائی مرحوم

از: مصطفےٰ علی اسیر لکھنوی (ذاکر نگر۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵)

حیف ہے صد حیف ہے ہم سب سے رخصت ہو گئے
ندوۃ العلماء کے عالم باعمل عبد السلام
سنت نبوی پہ عامل، متقی پرہیزگار
عابد پُر شوق زاہد بے ریا شیریں کلام
پاک صورت نیک سیرت پیکر انسانیت
مخلص و ہمدرد سب کے خاصۂ رب الانام
زائر حرمین ہونے کا شرف حاصل ہوا
فضلِ حق سے باطفیل رحمتِ خیر الانام
ذات تھی ان کی اہم دینی اداروں کے لئے
غم زدہ کیسے نہ ہوں فرقت میں علمائے کرام
تیسویں تاریخ ہجری عیسوی چوبیس اگست
جمعہ کا دن حامل اکرام رب ماہِ صیام
دوپہر قبل از زوال آیا فرشتہ موت کا
چل بسے مقبول خاص و عام مشہور الانام
فجر تک تابع رہے ان کے حواس و ہوش سب
ہو گئے بے ہوش پھر پی کر مئے عرفان کا جام
نزع کا عالم ہوا طاری تو ایسے حال میں
نور تھا چہرے پہ لب پر کلمۂ حق لا کلام
آرزو تھی اُن کی یہ منٹ وطن کی ہو نصیب
خوش نصیبی تھی کہ اپنے باغ میں پا بامقام
دل شکستہ مصطفےٰ کی رات دن ہے یہ دعا
رحمتِ رب با تو بھائی کی لحد پر ہو دوام
مصرعِ تاریخ آیا "لوحِ زیبا" کو لئے
جنت الفردوس میں جنت نشیں عبد السلام
۶۴
۱۹۷۹ = ۱۹۱۵ + ۶۴

دیگر

اٹھی ہے دنیا سے کون ہستی بچشم گریاں ہر آدمی ہے
ہے کس کا ماتم چہار جانب یہ تھوینڈی میں شور کیسا
ندا یہ آئی وہ مرد مومن وہ آشنائے رموز ہستی
شریعت احمدی پہ عامل خدا تعالیٰ کا خاص بندا
رہا جو بندوں کے ساتھ شامل رہا جو اپنے خدا سے واصل
وہ سوئے ملکِ عدم گیا ہے ملا ہے اس کو مقام اعلا
ہیں رنج و غم سے نڈھال سارے رہے جو اس کو عزیز ہر دم
سبھی کو حیرت سبھی پریشاں کیا ہے اس نے سفر کہاں کا
ملکیں دنیا سنیں یہ دل سے۔ برائے تاریخ سالِ رحلت
صدائے رضواں یہ آ رہی ہے سلام باغ جناں میں پہنچا

دینی مدارس کا نیا تعلیمی سال

مولانا اسحٰق جلیس ندوی مرحوم

ہمارے ملک میں دینی مدارس کے تعلیمی سال کا آغاز اسی ماہ شوال سے ہوتا ہے۔ ہندوستان میں سیکڑوں چھوٹے بڑے عربی مدارس ہیں، ان عربی مدارس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کے معماروں کا بار اس ملک کے وہ دیندار مسلمان برداشت کرتے ہیں جنکی اکثریت مڈل و پسماندہ ہے۔ اعلیٰ معیار زندگی اور معاشی خوشحالی کے لئے مسلسل تگ و دو اس دور کا عام مزاج بن گیا ہے، اس ریس کیا ادارے اور اشخاص ایک دوسرے سے سبقت لیجانے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ ایسے مادی دور میں مادی وسائل، حکومت کی اعانت اور مالی استحکام سے بے نیاز دینی مدارس بلا مبالغہ قناعت، قربانی، استغناء اور توکل علی اللہ کے مراکز ہیں

جہاں آدم گری اور مردم سازی کا کام ہوتا ہے،

جہاں علم کی لذت اور اس کی خدمت کا جذبہ پیدا کیا جاتا ہے،

جہاں خدا شناسی کی تعلیم اور اعلیٰ مقصد زندگی کی جہانبانی ہوتی ہے،

جہاں شکم و تن کے محدود دریچہ سے نکل کر صحیح مقصد زندگی اور زندگی بعد موت کی بیکراں وسعتوں سے آشنا کیا جاتا ہے۔

جہاں سے نکلنے والے تخریب کاری اور بے راہ روی سے ملک و سماج کے لئے مسئلہ نہیں بنتے۔

جہاں سے انسانیت کو اپنے درد کے درماں اور مرض کا چارہ ساز ملتے ہیں،

جہاں تعلیم پانے والے ان ڈگریوں کو لے کر تو نہیں نکلتے جو مادی ترقی اور معاشی خوش حالی کے لئے برائے نام ضمانت ہوتی ہیں البتہ وہ قناعت و قربانی، زہد و توکل کی اس دولت سے مالا مال ہوتے ہیں، جس کا آج کے مادی نظام تعلیم میں وجود نہیں ہے۔ ان کا جذبۂ ایثار و قربانی زندگی کے ہر موڑ پر انہیں متوازن و قانع رکھتا ہے یہی وجہ ہے وہ بیکاری سے تنگ آکر جھک سے پریشان ہو کر خودکشی نہیں کرتے۔ ڈاکہ نہیں ڈالتے اپنی جوانی اور طاقت کا ایسا مظاہرہ نہیں کرتے کہ سماج کے شریف و کمزور طبقات ان کے نام سے پناہ مانگیں، اور انہیں آفت و مصیبت سمجھیں۔

ان دینی مدارس نے عام انسانیت کی خدمت کے علاوہ ملت کے امتیاز اور دینی مزاج کے تحفظ و بقا میں وہ کردار ادا کیا ہے جو بڑی سے بڑی حکومت اور بہتر سے بہتر وسائل و دولت سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ ملت کے کروڑوں افراد اور ان کی آنے والی نسلوں کی دینی زندگی، خدا اور اس کے رسول سے وابستگی اور مساجد کی آبادی میں دینی مدارس کے فضلاء کی کوششوں کو بڑا دخل ہے۔ اسلامی تہذیب اور اس کے آثار کے قیام و بقا میں ان مدرسوں اور ان کے بوریہ نشین اساتذہ اور طلبہ کا کتنا زبردست حصہ ہے اس کا اندازہ حکیم شرق ڈاکٹر اقبالؒ کے درج ذیل آفتابی سے ہو سکتا ہے:۔

"حکیم احمد شجاع اپنی کتاب "خون بہا" حصہ اول ص۲۳۹ پر رقم طراز ہیں:۔

"لاہور آکر میں نے پاک پتن شریف (فقیری کے سلسلہ) کی نفسیاتی کیفیت اور اپنے ان احساسات کی روداد ڈاکٹر محمد اقبالؒ کو سنائی۔ وہ پہلے تو حسب عادت میری باتیں غور سے سنتے رہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں میرے احساسات سے ہمدردی ہے، پھر آنکھیں بند کر کے سوچنے لگے، اب میں اپنی کہانی سنا چکا تو فرمایا:۔

"جب میں تمہاری طرح جوان تھا تو میرے قلب کی کیفیت بھی ایسی تھی، میں بھی وہی کچھ چاہتا تھا جو تم چاہتے ہو۔ انقلاب ـــــ ایک ایسا انقلاب جو ہندوستان کے مسلمانوں کو مغرب کی مہذب اور متمدن قوموں کے دوش بدوش کھڑا کر دے۔"

پھر علامہ اقبالؒ نے فرمایا:۔

ان مکتبوں (مدارس) کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو انہی مدارس میں پڑھنے دو۔ اگر یہ مولوی، مُلّا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ جو کچھ ہوگا

(بقیہ ص ۱۶)

میں انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ اگر ہندوستان کے مسلمان ان مدرسوں کے اثر سے محروم ہو گئے تو بالکل اسی طرح جس طرح اندلس (اسپین) میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈر اور الحمراء اور باب الاخوین کے نشانات کے سوا اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا ٹھیک اسی طرح میں بھی آگرے کے تاج محل اور دہلی کے لال قلعے کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔"

دنیا جانتی ہے کہ ڈاکٹر اقبالؒ کسی عربی مدرسہ کے فارغ التحصیل عالم اور کسی کتب کے ملّا نہیں تھے، دینی مدارس کے سلسلہ میں ان کے یہ چند جملے ان کے وسیع مطالعہ اور تجربات اور گہرے غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔

یہ تحریر آج بھی ان لوگوں کو دعوت غور و فکر دیتی ہے جو دینی مدارس کی افادیت کے قائل نہیں۔

ان مدارس کی ایک اور اہم خصوصیت عام طور پر نظر انداز

یہی کشتی ملّت کے ناخدا ہونگے

عربی مدارس کے قیام کا سب سے بڑی غرض یہ تھی کہ یہاں دین و ملت کے ایسے سپاہی تیار کئے جائیں جو ہر حال میں اسلام کی حفاظت کر سکیں اور الحاد و بے دینی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک سکیں، آغاز کار کے وقت ان درسگاہوں نے اس زمانہ کے حالات کے مطابق مفید و مؤثر لائحہ عمل تیار کیا تھا، اور نصاب و نظام تعلیم کے ایسے خاکے بنائے تھے جو اس وقت کی ضرورت کے مطابق تھے۔ چنانچہ وہ فضا قائم رہی یہ نظام تعلیم مفید اور کارگر ثابت ہوا لیکن اب جب کہ عرصہ سے حالات بدل چکے ہیں ضرورت ہے کہ ہماری درسگاہوں میں بھی انقلاب ہو، زمانہ کی نئی ضرورتوں کے مطابق پھر سے نصاب تعلیم مرتب ہو اور تعلیم و تربیت کے ایسے اسلوب اختیار کئے جائیں جو طلبہ کو وقت کی ضرورتوں کے مطابق زندگی کے نئے میدانوں کے لئے تیار کر سکیں، یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آج کے طلبہ کل کے علماء ہوں گے، قوم کی باگیں ان کے ہاتھ میں ہوں گی اور یہی کشتی ملت کے ناخدا ہوں گے۔

اسلام دوسرے مذاہب کی طرح صرف چند دعاؤں اور عبادتوں تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہے، دین و دنیا کی راہبانہ تفریق کی اسلامی تعلیم میں کہیں گنجائش نہیں، ضرورت ہے کہ اسلامی تعلیم گاہوں کا نصاب و لائحہ عمل ترتیب دیتے وقت یہ حقیقت پیش نظر رہے تاکہ آئندہ کوئی بنیادی غلطی نہ ہونے پائے اور ایسے تعلیمی مرکز قائم ہو سکیں جو دین و دنیا کی جامعیت کے نمونے ہوں آج جو فتنے اٹھ رہے ہیں ان کا تدارک اگر ممکن ہے تو صرف اسی وقت جب کہ ہم اس بنیادی سوال کو حل کر لیں اور اس اصول کی روشنی میں اپنے مدارس پر ایک اصلاحی نظر ڈال لیں۔

یہ باتیں عرصہ سے ہو رہی ہیں اب شاید مشکل ہی سے کوئی حلقہ ایسا ہو جو حالات کی نزاکت کو محسوس نہ کرتا ہو اور اس کے تدارک کے لئے بیقرار نہ ہو۔ ضرورت ہے کہ یہ باتیں اب عمل کا قالب اختیار کریں اور خیالی خاکوں میں حقیقت کا رنگ بھرا جائے، دین و ملت کے خدمت گذار کسی جگہ جمع ہوں جزئی اور فروعی اختلافات نظر انداز کر کے مستقبل کی فکر کریں اور آنے والے خطرات کے پیش نظر ایک نئی تنظیم اور ایک نئے اتحاد کی بنیاد ڈالیں، جہاں تک ندوہ کے خادموں کا تعلق ہے وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی اتحاد و تعاون کے لئے ہیں اور اپنی بساط کے مطابق ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں۔

(مولانا عبد السلام ندوی مرحوم)

ھمدم دیرینہ کا بچھڑنا

از: انیس چشتی۔ پونہ

مولانا اسحٰق جلیس ندوی کے انتقال کی خبر پونہ والوں پر بجلی بن کر گری۔ حیرت سے لوگوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ پونہ والوں کو مرحوم پر بڑا ناز تھا۔ وہ شمالی ہندوستان کے لیے مہاراشٹر کا تحفہ سمجھے جاتے تھے۔ اب لاکھ تعزیتی جلسے ہوں، ایصال ثواب کی مجلسیں ہوں، جو کھویا سو کھویا۔ جواں مرگ ساتھیوں کا غم بہت شدید ہوتا ہے اور پھر ایسی شخصیت جس سے ملّت کی امیدیں وابستہ ہوں، جسے دل زندہ کی لذّت نصیب تھی جس نے ابھی اڑنے کے لیے پر کھولے تھے جس نے ابھی بلند پروازی کے لیے لمبا سانس لیا تھا۔ کسے یقین تھا کہ موت کا دامِ سخت اس کے آشیاں سے اتنا قریب تھا کہ اڑتے ہی گرفتار کر لیا جائے گا۔

مولانا اسحٰق میرے والد کے دوستوں میں تھے۔ میں ان سے عمر میں چھوٹا تھا۔ بعد میں یہ ہوا کہ وہ میرے دوستوں میں سے ہو گئے۔ چنانچہ ہم دونوں میں احترام اور بے تکلفی، دوستی اور بزرگی کی ایک ایسی ہموار فضا بن گئی تھی جس کے لئے کسی خاص لفظ کا انتخاب میرے بس میں نہیں۔

مولانا اسحٰق جلیس کا نام آتے ہی کسی متحرک شے کا تصور ذہن میں آنا ضروری ہے ہر وقت مصروف۔ غضب کا اختراعی ذہن پایا تھا۔ لکھنے میں، پڑھنے میں، بولنے میں، بحث میں، غرض ہر کام میں یکتا، انہیں جلدی مچی رہتی، ہر کام کی جلدی۔ سست آدمی کا ان کے ساتھ نباہ مشکل تھا۔ میں اپنی تمام تر تیزی کے باوجود کاموں میں ان سے پیچھے رہ جاتا۔ وہ مجھ سے الجھتے اور کبھی کبھار ان کی عجلت پسندی پر میں انھیں ٹوک بھی دیا کرتا ـــــ کہا کریں گے تو جلدی، چلیں گے تو جلدی، ہر کام میں تیزی اور عجلت ـــــ جیسے ان کو پتہ چل گیا ہو کہ جلدی جانا ہے اس لیے ہر کام کو جلدی جلدی نپٹا دو۔

ندوہ سے فراغت کے بعد ان کی اکثر نے بعد میں مولانا اسحٰق کی مخالفت کی۔ مولانا پونہ کے مولانا محمد علی جوہر ثابت ہوئے۔ انھوں نے راستہ صاف کیا، نئے چہروں نے اپنی سیاست کی گاڑی آگے بڑھائی۔ یہ لوگ آج بھی پونہ کی سماجی اور سیاسی فضا پر چھائے ہوئے ہیں۔

نوجوانوں سے انہیں خاص دلچسپی تھی آج کے نوجوان نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ انتہائی مخدوش، غیر صحت مند، علم و عمل سے عاری اور متضاد تحریکوں اور رجحانات کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ غیر یقینی مستقبل نے مسلمان نوجوانوں میں ایک طرح کی بے راہ روی پیدا کر دی ہے، جو لوگ سماجی کاموں سے واقف ہیں وہ میری اس بات سے اتفاق کریں گے کہ آج کے دور کا سب سے مشکل کام جوانوں کی تنظیم ہے۔ پڑھے لکھے، صالح، مخلص کسی سیاست کا کھلونا نہ بننے والے، اسٹنٹ بازی اور ہنگامہ آرائی سے دور، جلد مشتعل نہ ہونے والے، عمدہ سماجی اور سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے، سلیقہ مند، صبر و تحمل کے پیکر، مقصد کے حصول میں عجلت نہ کرنے والے جوانوں کا ملنا نہ صرف مشکل بلکہ لگ بھگ ناممکن سا ہے۔

بھیڑ بہت ملے گی لیکن کام کے لوگ چند ایک ہی ملیں گے۔ اب اگر جوانوں میں کوئی کام کرنا ہو تو پہلے نہایت پتہ ماری سے انہیں چھانیئے، سدھاریئے، ان کی ایسی تربیت کیجئے جو آپ کی تنظیم کے لئے مفید و معاون ثابت ہو نہ اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ان کی تنظیم کو نظر بد سے بچانے کے لئے روئیے، گڑگڑائیے، دعائیں مانگئے، دوسرے بزرگوں سے بھی دعاؤں کی درخواست کیجئے ـــــ مولانا اسحٰق صاحب نے پونہ میں "مجلس فلاح ملت" کے قیام کے بعد یہ سب کچھ کیا۔ یہ ایک سماجی ادارہ تھا جس کا مقصد نہ صرف جوانوں کی تنظیم تھا بلکہ ہر شعبۂ زندگی میں ان کی مستقل رہنمائی تھا۔ اس ادارے نے اپنا ذاتی اخبار "ملت ٹائمز" بھی شائع کیا، مولانا اسحٰق اس کے مدیر تھے، اخبار کی ہر چال اپنی آواز تھی۔ اس نے پونہ کے مسلم دشمن عناصر کو بھی جھنجھوڑا۔ جلد ہی اس انجمن نے تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ کاش کہ اس مجلس کو مخلص افراد میسر آتے۔ مجلس فلاح ملت ۱۹۶۵ء میں شروع ہوئی تھی اور ۱۹۶۹ء کے قریب قریب یہ تحریک تقریباً ختم ہو کر رہ گئی۔ اخبار بند ہو گیا اور مولانا اسحٰق لیڈی حوا ہائی اسکول میں استاذ عربی مقرر ہو گئے۔ ان کی بے باکی اور مقبولیت سے یہاں کے انتظامیہ کی بھی کور دبتی تھی۔ انہوں نے ایسے حالات پیدا کئے کہ مولانا نے غصے میں آکر اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ وہ دن ہے مولانا پر بہت سخت تھے، وہ چاہتے تو فلاح ملت کے فنڈ سے (جس کے وہ ہنوز صدر تھے) اپنے اخراجات چلا سکتے تھے لیکن لوگ گواہ ہیں کہ انہوں نے اپنا اثاثہ البیت بیچ بیچ کر اپنے خاندان کی کفالت کی۔

پونہ میں مولانا اسحٰق کی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ لوگوں کو "مشاورت" کے دور میں اور "مجلس فلاح ملت" اور "ملت ٹائمز" کے اجراء کے وقت ہوا۔ انہوں نے کچھ شرپسندوں کے جواب میں مسلم پرسنل لا کی خواتین کا نفرنس بلائی تھی۔

ان کی "ندویت" لوگوں کے سر چڑھ کر بولی۔ کوئی موضوع ہو، ان کی زبان اور قلم کبھی کوتاہ ثابت نہیں ہوئے، ان کی متحرک شخصیت نے پورے شہر کو اپنے احاطے میں لے لیا تھا۔ وہ سراپا تحریک تھے۔

رات رات بھر پرچہ تیار ہو رہا ہے۔ نئے کھلاڑیوں کے لئے تقریریں لکھی جا رہی ہیں، جلسوں کے زائچے بن رہے ہیں۔ نہ خود سوتے ہیں نہ لوگوں کو سونے دیتے ہیں کئی کئی ہفتے ایسے گذر جاتے کہ وہ چند گھنٹوں سے زیادہ سونے نہ پاتے۔

بہت اچھے لکھنے اور بولنے کے علاوہ وہ بہت اچھے سننے والے بھی تھے۔ ایسے ایسے

ورنہ یوں ہوتا کہ لوگ انہیں اسٹیشن رخصت کر کے آتے اور وہ شام پھر بمبئی سے لوٹ آتے، کہتے کہ انشراح نہیں ہے۔ حضرت مولانا ان دنوں حیدر آباد آئے ہوئے تھے۔ ہم نے موقع غنیمت سمجھا کہ کسی طرح یہ حیدر آباد پہنچ جائیں۔ چنانچہ میں انہیں گاڑی میں بٹھا کر نہیں بلکہ یوں سمجھ لیجئے کہ ٹھونس کر آیا اور بھیڑ کی وجہ سے رخصتی مصافحہ بھی نہیں کر سکا۔ وہ حیدر آباد کیا گئے، پونہ سے ہمیشہ کے لئے لکھنؤ چلے گئے۔

لکھنؤ پہنچ کر اور اپنے شیخ کے قدموں میں رہ کر ان کی طبیعت اور شخصیت میں زبردست نکھار پیدا ہو گیا تھا۔ لکھنؤ پہنچ کر ان کے تین کارناموں نے صرف حلقۂ احباب کو ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کو متاثر کیا۔

۱۔ ندوۃ العلماء کے ۸۵ سالہ جشن کی اسلامی نمائش۔

۲۔ پندرہ روزہ تعمیرِ حیات۔

۳۔ تحریک پیام انسانیت میں انکا وجود۔

مجھے لکھنؤ اکثر جانے اور ندوۃ العلماء میں ہفتوں قیام کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے وہاں میں نے ان کے اطراف ہمیشہ طلبہ کا جمگھٹا دیکھا۔ حالانکہ ان کے ذمے درس و تدریس کی کوئی خدمت نہیں تھی۔ لائبریری کا نظم اور تعمیرِ حیات کی ادارت۔ بس یہ دو ذمہ داریاں ان کے سپرد تھیں۔ طلبہ ان سے بڑے مانوس تھے۔ طلبہ کی ایسی فوج ہماری بچی زبان میں "اجتنہ" یعنی "جن" کی جمع کہلاتی ہے، ایک ہفتے کا کام چار گھنٹے میں کرنا ہو تو مولانا اسحٰق سے کہہ دیجئے۔ چراغ گھستے ہی جنات حاضر۔ اب آپ جو چاہیں کروا لیجئے۔

جشنِ ندوہ کے سلسلے میں انہوں نے مجھے اجلاس سے پہلے ہی لکھنؤ بلوا لیا تھا۔ ابھی میں اسٹیشن سے پہنچ کر سانس بھی نہیں لے پایا تھا کہ انہوں نے کاموں کا انبار میرے سامنے پیش کر دیا۔ اس روز رات تین بجے تک مجھے جگائے رکھا اور اتنا کام لے لیا کہ آٹھ آدمی مل کر آٹھ دن میں بھی نہیں کر سکتے تھے۔

نمائش کے سلسلے میں انہوں نے جس عرق ریزی اور جانفشانی سے ندوہ کی تاریخ مرتب کی تھی وہ کام پوری ایک اکیڈمی کر سکتی تھی۔ ندوہ کے مختلف ادوار کو ناظرین ایک نظر میں ملاحظہ کر سکتے تھے۔ مصنفینِ ندوہ کو کچھ اس انداز میں پیش کیا کہ گویا وہ اپنی کہانی آپ بیان کر رہے ہوں۔ نمائش میں ان کے ذوقِ مطالعہ، وقت نظر، سخت کوشی، علمی بصیرت کے علاوہ ان کا ذوقِ جمال اور پیش کش کا سلیقہ بھی جھلکتا تھا، کتنے ہی ریسرچ اسکالر اب تک اس سرمائے سے فیض اٹھا رہے ہیں۔

ان کے سیال قلم نے "تعمیرِ حیات" میں جان ڈال دی تھی، اداریہ ایسا لکھتے جس سے بہتر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ "بھٹو نامہ" ان کے مزاح، بے باکی اور سیاسی بصیرت کی روشن دلیل ہے۔ اس شمارے کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ اس کے اب تک ۵، ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل چکے ہیں۔ اس شمارے میں ان کا مضمون پڑھنے کے بعد لوگوں کے ذہن بدل گئے۔ ضیاء الحق کو پیدائشی گناہ گار اور بھٹو کو ازلی غوث الاعظم کہنے والوں کی زبان و قلم پر تالے پڑ گئے۔ تعمیرِ حیات صالح صحافت کی عمدہ نظیر ہے۔

جلسوں کی رپورٹنگ ایسی کرتے کہ پورا منظر کھنچ جاتا، جیسے کوئی فلم چل رہی ہو۔ جلسے کے اکابرین شرکا نے بعض مرتبہ ان کی اس طرح سے رپورٹنگ پر اظہارِ حیرت کیا کہ یہ آخر اتنا سب کچھ کب لیتے تھے تو اس پر حضرت علی میاں نے فرمایا کہ "ان کا دماغ ہر وقت حاضر رہتا تھا۔ نہ صرف دماغ بلکہ دل بھی۔"

تحریک پیام انسانیت کے پُرزور داعی، مبلغ اور سپہ سالار تھے۔ اس تحریک میں ان کے پورے قوائے عمل کو کام کرنے کا موقع مل گیا تھا خود حضرت علی میاں نے فرمایا کہ ایسی تقریر کرتے تھے کہ اس کے بعد کسی کو کچھ بولنے کی گنجائش باقی نہ رہتی۔ بعض مرتبہ رسماً اور بعض مرتبہ تبرکاً کچھ کہہ سن کر جلسہ برخاست کرنا پڑتا۔ تحریک پیام انسانیت ان کا اوڑھنا بچھونا بن چکی تھی، جب کہیں ذرا سا وقت ملتا تحریک کی بات کر ڈالتے۔ وزراء کی موجودگی میں اسٹیج پر، ریل میں، موٹر میں، اسٹیشن پر، یہاں تک کہ نائی کے ہاں خط بناتے تک میں سامنے والا ایسا متاثر ہوتا کہ ہاتھ جوڑتے جوڑتے نہ تھکتا۔ خود فرماتے کہ آج کل مجھ پر پیام انسانیت کا جن سوار ہے۔ تحریکوں کو جب ایسے افراد مل جاتے ہیں تو پھر وہ تحریکیں نہیں رہتیں بلکہ عوام کا معمول بن جاتی ہیں۔

زندگی کا اس سے بڑا لطف کیا ہو سکتا ہے کہ زندہ رہیں تو حضرت مولانا کے سایۂ عاطفت میں رہیں اور موت کا اس سے بڑا عیش کیا ہو سکتا ہے کہ مرکزِ رائے بریلی میں دفن ہوں۔ مولانا اسحٰق دونوں صورتوں میں خوش نصیب ثابت ہوئے، جب تک زندہ رہے اپنے شیخ کی توجہ کا مرکز بنے رہے اور مرے تو ان ہی کے قدموں میں پڑے رہنے کو جگہ ملی۔

ہم میں مشترک بات یہ بھی تھی کہ حضرت کی عمر میں برکت کے لئے اگر دعا کرتے جس سے یہ بھی خواہش رہتی کہ اگر خدانخواستہ حضرت کی عمر میں کوئی کوتاہی ہو تو اللہ ہماری عمر کو اس کا تخمینہ بنا دے۔ اللہ تعالیٰ نے اسحٰق صاحب کی سُن لی اور وہ دیکھتے دیکھتے صرف ۴۴ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ اپنے شیخ کا دستِ راست، شیخ کے ایک ایک لفظ کو موتیوں کی طرح قیمتی سمجھنے والا خود قدر کرنے والا اور دوسروں کو قدر دان بنانے والا رخصت ہو گیا۔ ایک آفاقی شخصیت گم ہو گئی، ایک فعّال ترین شخصیت سے ملت محروم ہو گئی جس کی نظریں دست تھی، دماغ قائدانہ صلاحیتوں کی پوری صلاحیت رکھتا تھا، جس کے دنوں میں پیش تھی شبوں میں گذارتا تھا، پیشانی عبادت کے لیے وقف تھی اور دل سوز سے پُر تھا۔ آج ملت ایک ایسی شخصیت سے محروم ہو گئی جو اپنی یہ پارہ صفتی کے لئے دور و نزدیک مشہور تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ۔ ع

مرقد کاشتاں بھی اسے راس نہ آیا
آرام قلندر کو تہہ خاک نہیں ہے

کیونکہ ۔

خاموشیٔ افلاک تو ہے قبر میں لیکن
بے قیدی و پہنائی افلاک نہیں ہے

بقیہ صفحہ ۱۶

اس سے نجات دلاتا ہے بلکہ متوسط بستے اور چھوٹے بستے کے علاوہ شہروں اور دیہات میں بسنے والوں کے دریان رابطے کا ذریعہ ہے۔ ان کے خیال میں اسلام زیادہ تر جمہوری طرزِ حکومت سے قریب ہے کیونکہ ایسے ممالک میں جہاں حکمران طبقہ اپنے سامراجی آقاؤں کی طرح عوام سے الگ تھلگ بستا ہے اسلام مردوں کی حد تک ایک عوامی نظام ہے۔ انڈونیشیا اور ملائیشیا میں دانشور و طلباء اور دیگر پیشہ ور افراد و مسائل کی تنظیم میں عدم مساوات اور غیر عسکری سرمایہ کاروں کے مقابلے میں مقامی تاجروں کی اجارہ داری کی خدمت کرتے ہیں۔ ان ممالک میں پایاں بازدہ اکثریت پر بڑی ہوئی تبدیلی کا مطالبہ کرتا ہے تاہم یہ تبدیلی غیر منظم اور غریب ہے۔ لہٰذا اکثر جیلوں میں بند ہوتا ہے۔ ان حالات میں اسلام کے ذریعے سے تبدیلی کا مطالبہ کرنا اور حکومت پر گرفت چھین کر آسمانی ملک کے بارے میں جب کہ یہ نہ کچھ کیا جا سکے یہاں تک انتظامی اور سیاسی نظام عام آدمی کی حالت بدلنے میں ناکام رہے ہیں اس وقت تک اسلامی تحریک کے احیاء کا فلسفہ کچھ میں نہیں آئے گا۔

...رج میں کرد باغیوں اور ایرانی فوج کے درمیان شدید لڑائی

...یرانی پر حملہ کر کے فوجیوں اور انقلابی محافظوں سے تمام اسلحہ چھین لیا جبکہ ۳۰ فوجی گرفتار کر لئے گئے۔ ایرانی فوج کے ترجمان کا دعویٰ ہے کہ ۱۰۰ باغی ہلاک ہوئے۔ ایرانی فوج کے ۱۰ ٹینک اور ۲ ہیلی کاپٹر تباہ ہوئے۔ ایران کے سرکاری ٹیلیویژن نے کہا کہ ایرانی فوج نے کردستان کے دارالحکومت سنندج میں کردباغیوں اور ایرانی فوج میں بڑے پیمانے پر لڑائی چھڑ گئی ہے۔ کردستان ڈیموکریٹک پارٹی کے ایک گیریژن پر حملہ کر کے فوجیوں اور انقلابی محافظوں سے تمام ہتھیار اور گاڑیاں چھین لیں جبکہ ۳۰ فوجی، جن میں لیفٹیننٹ کرنل اور ۲ میجر شامل ہیں یرغمال بنا لئے گئے۔ ایران کے سرکاری ٹیلیویژن نے کہا کہ کردباغیوں نے ۱۰۰ فوجیوں کو ہلاک کر دیا ہے۔ ایرانی فوج کے ترجمان نے کہا کہ ۱۰۰ باغی ہلاک ہوئے۔ ۱۰ ٹینک اور ۲ ہیلی کاپٹر تباہ ہوئے۔ ایران کے سرکاری ٹیلیویژن نے کہا کہ کردباغیوں نے ۱۰۰ فوجیوں کو ہلاک کر دیا ہے۔ ایرانی فوج کے